تلخیص محاضرات سیرت

محمد رضا تیمور

Summary of "Muhaadaraat-e-Seerat"

This work is a precise summary of the book "Muhaadarat-e-Seerat" authored by Dr. Mahmood Ahmad Ghazi (1950-2010), which deals with Seerah-Sciences ('Ulûm-e-Sîrat), not with Seerah itself. The 768 pages book portrays a thought provoking understanding of the discipline of Seerah; its evolution of Seerah-writing; suggests new methods of Seerah-writing within the disciplines of contemporary social sciences i.e. Sociology, Psychology, Political Science, Economics, History, Geography and Theology. The book has been produced on the bases of the lectures delivered by the learned scholar of 20th century. An attempt has been made to highlight the major themes of in this summarised treatise.

باب اول: مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت

اسلامی علوم کا ارتقا اور استقصا صدیوں پر محیط ہے نیز ان علوم کی عقلی توجیہ کے لئے باقاعدہ علم الکلام بھی وجود میں آیا۔ اس طرح سے اسلامی علوم کا ایک خاص مزاج ترکیب پایا۔ چناں چہ جب جدید علوم نے یورپ کے سیاسی ومعاشی غلبے کے دوش پر اپنا اثر قائم کیا تو اسلامی علوم کا فہم اجنبی محسوس ہونے لگا۔ اس صورت حال میں مسلمان مفکرین نے جن اسلامی علوم کے احیا کا بیڑہ اٹھایا، ان میں سیرت کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ زیرنظر مضمون میں جدید دور میں علم سیرت کی اہمیت وضرورت کا جائزہ لیا جائے گا۔

مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت مسلمانوں کے لئے بھی ہے اور غیر مسلموں کے لئے بھی۔ مسلمان جن محرکات کی بنا پر سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی نوعیت، ظاہر ہے، غیر مسلموں میں پائے جانے والے

محرکات سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر مسلمانوں کے اندر سیرت کے مطالعے کی مختلف سطحیں ہیں، عامۃ الناس کی سطح متخصصین کی سطح سے مختلف ہے۔ اور جب ہم بات کرتے ہیں دور جدید کی تو جدید رجحانات کے تناظر میں مطالعہ سیرت کے نئے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ دور جدید کے تہذیبی، تاریخی، علمی اور بین الاقوامی رجحانات ونظریات کے پیش نظر سیرت کے مطالعے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ غیر مسلموں کے حوالے سے دعوت فکر کے لئے اور مسلمانوں کے حوالے سے دعوت عمل اور جدید رجحانات کے تناظر میں اپنی پہچان کو دنیا پر واضح کرنے کے لئے۔ لہٰذا اس مضمون میں دو باتیں شامل ہیں۔ سیرت کا تعارف اور موجودہ عالمی نظام کے حوالے سے سیرت کی اہمیت!

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی بابرکت دین کا محور ہے، حتیٰ کہ قرآن کی تشریح بھی ہم ان ہی کے اقوال وارشادات سے کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر قرآن مجید صامت یعنی خاموش قرآن ہے تو رسول اللہ ﷺ کا وجود گرامی قرآن ناطق ہے۔ اللہ نے محض نظری ہدایت پر اکتفا نہیں کیا بل کہ اپنی رحمت کاملہ سے ایک عملی نمونہ بھی بھیجا، جسے ہم سیرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو قرآن نے کہا وہ حضور نے کیا اور جو حضور نے کیا وہ قرآن نے کہا (۱) لہٰذا قرآن کے تمام عجائب رسول اللہ سے منسوب ہیں اور چوں کہ قرآن کے عجائب لامتناہی ہیں (۲) تو صاحب قرآن کے عجائب کس طرح متناہی ہو سکتے ہیں۔ ان ہی لامتناہی عجائب کو احاطہ تحریر میں لانے کی جستجو میں ہم سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ پاتے ہیں جو پہلی صدی ہجری سے آج تک بغیر کسی تعطل کے چلا آرہا ہے اور ہر سیرت نگار کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ابھی تو کام کا آغاز ہوا ہے۔

سیرت کا لفظ فعِلَہ کے وزن پر ہے اور اس وزن پر آنے والے مصدر کے معنی کسی کام کے طریقے کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا سیرت کے لغوی معنی چلنے کا طریقے کے ہیں۔ اسی کی توسیع سے عربی میں سیرت کے لغوی معنی زندگی گزارنے کے اسلوب کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ساتھ سیرت کے لفظ کا استعمال سیرت نگاری کے آغاز سے کچھ عرصے بعد شروع ہوا لیکن آج دنیا کی تمام زبانوں میں سیرت کا لفظ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ لفظ اب انگریزی لغات میں بھی ان ہی معنوں میں شامل ہو گیا ہے۔

قدیم مفسرین، فقہا، محدثین اور سیرت نگاروں نے سیرت کا لفظ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اس طرز عمل کے لئے استعمال کیا جو آپ نے غیر مسلموں سے معاملہ کرنے (جس میں جنگیں، صلح اور معاہدات آتے ہیں) میں اپنایا۔ (۳) لہٰذا یہ ایک پہلو سے تو تاریخ اسلام کا مضمون ہے جب کہ دوسرے پہلو سے اسلامی قانون اور فقہ کا بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں غزوات بھی لڑے، مختلف قبائل

(جن میں یہودی، عیسائی، مشرکین سب شامل تھے) سے معاہدات بھی کئے اور ان کے لئے منشور بھی جاری کئے، لہٰذا آپ ﷺ کی رحلت کے بعد اسلامی فتوحات کے باعث جو بے شمار اقوام سے واسطہ پڑا ان سے معاملہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے رہ نمائی کے لئے رسول اللہ ﷺ کے ان ہی غزوات کو نمونہ بنایا۔ لہٰذا ان عوامل کو بنیاد بنا کر فقہائے اسلام نے ایک نئے قانون اور نظام کی تشکیل کی۔ اس کے لئے سیرت اور سیر کی اصطلاح استعمال کی گئی جو انسانی تاریخ میں پہلا بین الاقوامی قانون ہے۔ (۴) اس قانون کی تدوین اور ترتیب دوسری صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے پہلے کر لی گئی اور اس پر متعدد مبسوط اور مفصل کتابیں لکھی گئیں جو آج بھی موجود ہیں۔

سیرت نگاری کے آغاز سے ہی اس کے دو پہلو نمایاں ہو گئے۔ ایک پہلو تاریخی تھا جو سیرت نگاری کا عمومی اسلوب تھا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے واقعات کو ترتیب سے جمع کیا گیا تھا۔ یہ مغازی کے نام سے مشہور ہوا۔ جلد بعد مغازی کا وہ حصہ جو فقہی رہ نمائی اور ہدایات پر مشتمل تھا الگ حیثیت سے احاطہ تحریر میں لایا جانے لگا، وہ سیرت یا سیر کے نام سے نمایاں ہو گیا۔ یہ سیرت نگاری کا قانونی پہلو تھا۔ لہٰذا بالکل آغاز میں تو مغازی اور سیر ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ (۵) لیکن بعد میں تاریخی انداز کو مغازی اور قانونی انداز کو سیر سے موسوم کیا گیا۔ مزید وقت گزرنے کے ساتھ سیرت میں وہ تمام باتیں شامل ہوتی گئیں جن کا رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ سے براہِ راست تعلق تھا۔ بالآخر عمومی طور پر سیرت نگاری کا نام علم سیرت قرار پایا اور مغازی اس کا ایک شعبہ قرار دیا گیا۔ لہٰذا برصغیر کے اپنے وقت کے صف اول کے عالم، محدث اور فقیہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنی کتاب عجالہ نافعہ میں سیرت کی تعریف کچھ یوں کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی سے جو کچھ بھی متعلق ہے، آپ کے صحابہ کرام، اہل بیت اور آل عظام سے جو بھی چیز تعلق رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے لے کر اور آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے تک، ان سب کی تفصیل کو اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کہتے ہیں۔ (۶) دور جدید تک آتے آتے ایک تو سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تشریحات کی جانے لگیں جس سے کچھ مزید پہلو منظر عام پر آئے دوسرا سیرت نگاروں نے ہر اس چیز کو سیرت میں شامل کر لیا جس کا ذرا سا تعلق بھی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے بنتا ہے۔ لہٰذا اب علم سیرت ایک ایسا وسیع کینوس رکھتا ہے جو پورے اسلامی تمدن اور تاریخ کے مرحلہ آغاز اور رسول اللہ ﷺ کے پورے پیغمبرانہ حیات کا ایک لینڈ اسکیپ ہے۔

مسلمانوں کے لئے سیرت کی اہمیت اس کے تعارف سے ہی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

کی ذات قانون اور شریعت کا ماخذ ہے، لہٰذا ایک مسلمان کی زندگی کے لئے سب سے اہم چیز سیرت ہی ہے۔ دوسرا پہلو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت اور عقیدت کا ہے جو ایمان کی شرط اول ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے مطالعہ سیرت کو اس کی جزئیات تک پھیلا دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے متعلق معمولی سے معمولی بات، جو اگر نہ بھی ہوتی تو سیرت کی اہمیت میں کچھ بھی فرق نہ آتا، کی بھی کھوج لگائی گئی اور اسے احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ ایسے ہی جذبے کی بنا پر کیا گیا ایک کام ازواج مطہرات کے حجرات سے متعلق ہے جو ''بیوت النبی'' کے نام سے کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس میں یہ چیز بیان کی گئی ہے کہ ازواج مطہرات کے حجرات کہاں کہاں واقع تھے، ان کا رقبہ کتنا تھا، کیسے بنے ہوئے تھے وغیرہ۔ لہٰذا ایک طرف تو شریعت سے آگاہی کے لئے سیرت کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے، جب کہ دوسری طرف حب رسول کے ایمانی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے بھی مطالعہ سیرت بہت اہم ہے۔ شریعت سازی تو علماء کا کام ہے اور ہر مسلمان اس کا مکلف نہیں لیکن حب رسول ہر مسلمان کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔

غیر مسلموں کے حوالے سے سیرت کی اہمیت عالم گیریت کے تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دنیا میں ایک عالم گیر نظام کی اہمیت کو بڑے عرصے سے محسوس کیا جارہا ہے۔ دنیا میں چوں کہ مغربی اقوام سیاسی اور تہذیبی غلبہ رکھتی ہیں لہٰذا مغربی آقاؤں کی نظر میں اس عالم گیر نظام کا مطلب مغربی تہذیب کی عالم گیریت کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان دنیا کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ ہیں اور کوئی نظام انہیں نظر انداز کر کے نہیں بنایا جاسکتا۔ چوں کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ ایمان رکھنے والا مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کی ذات سے جذباتی وابستگی رکھتا ہے لہٰذا جس طرح مسلمانوں کے وجود کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سیرت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ عالم گیریت کے لئے جن باتوں کا ہونا ضروری ہے مغرب کی حکومتیں ان کے بارے کیا طرز عمل اپنائے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلے میں سیرت سے ہمیں کیا رہ نمائی ملتی ہے۔ یہ بحث عالمی تناظر میں سیرت کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ عالم گیریت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں مساوات کے اصولوں پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے اور انسانوں کے درمیان تفریق کو روا نہ رکھا جائے۔ دوسری ضروری چیز یک ساں طور پر انسانوں کو عدل وانصاف کی فراہمی ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ ہر انسان کے لئے امن وامان کے حق کو تسلیم کیا جائے اور عملاً وہ اسے مہیا بھی کیا جائے۔ چوتھی چیز علم وہنر (Science and technology) کے مختلف شعبوں تک تمام انسانوں کی یک ساں رسائی ہے اور آخری بات تہذیب وتمدن کو تمام انسانوں کی مشترکہ کاوش سمجھنا اور تہذیب کی بنیاد پر فرق کو ختم کرنا ہے۔ مغرب نے اپنے ممالک کی حد تک تو ان اصولوں کو پورا کر کے

تاریخ سے داد وصول کی ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ نہایت تاریک ہے۔ مغرب کی ترقی ہمیشہ محکوم قوموں کی ابتری کا باعث بنی ہے۔ دوسری اقوام خاص کر مسلمانوں کے معاملے میں ہمیشہ عالم گیریت کے اصولوں کو پامال کیا گیا ہے اور اس سب کے بعد مغربی تہذیب کی عالم گیریت کی بات کی جاتی ہے۔ مغرب کی مساوات کی اخلاقیات All are equals but some are more equals کا درس دیتی ہیں۔ ان more equals کو ویٹو کا حق دیا گیا ہے جنہوں نے ہمیشہ عدل وانصاف کی دھجیاں اڑائیں۔ بعض سائنسی علوم پر صرف more equals کا حق تسلیم کیا گیا اور دوسری اقوام خاص طور پر مسلمانوں کو ان علوم کی تحصیل سے منع کر دیا گیا۔ ایک تجارتی ٹاور کی تباہی پر War on America کا واویلا مچایا گیا لیکن افغانستان اور عراق میں لاکھوں مسلمانوں کے قتل پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اور سب سے بڑا مسئلہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں باقی تمام تہذیبوں کو کم تر اور وحشی (Barbarian) خیال کرنا ہے۔ مغرب کے اسی رویے کے باعث سموئیل پی ہنٹنگٹن تہذیبوں کے تصادم کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ (۷)

دوسری طرف دیکھا جائے تو عالم گیریت کے ان اصولوں کو پورا کرنے کی ضمانت رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اپنانے میں پائی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں ہر سطح پر لوگ ان اصولوں کی کم یابی کے باعث ابتری کا شکار تھے۔ عرب کے لوگ سب سے بڑھ کر مختلف بے ضابطگیوں کے مرتکب تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی ان تمام مسائل کو حل کر دیا۔ جہاں تک انسانوں کے مابین مساوات کا مسئلہ ہے تو ''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت نہیں'' کہہ کر ہر قسم کے فرق کا خاتمہ کر دیا گیا۔ (۸) عدل وانصاف کا معیار یہ تھا کہ اگر فاطمہؓ بنت محمد بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹنے کا حکم صادر کیا جائے۔ (۹) امن وامان کی یہ صورت حال تھی کہ ایک عورت حضر موت سے اٹھے اور تن تنہا بعلبک تک چلی جائے اس طرح کہ اس کے ہاتھ میں سونا ہو۔ (۱۰) علم نہ صرف یہ کہ ہر انسان کا حق مانا گیا بل کہ اسے ایک فریضے کی حیثیت دے دی گئی۔ (۱۱) اور جہاں تک تہذیب وتمدن کا تعلق ہے تو اسلامی تہذیب نے کبھی کسی قوم کے کارناموں کو رد نہیں کیا بل کہ انہیں اپنے دائرے میں شامل کر کے مزید ترقی دی۔ الغرض عالم گیریت کو فروغ دینے اور اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لئے اگر کسی شخصیت کی زندگی رہ نمائی دے سکتی ہے تو وہ صرف محمد ﷺ کی زندگی ہے اور اس کی تفصیلات جاننے کے لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسماء الرجال ایک ایسا علم ہے جو سیرت، حدیث اور اسلامی تاریخ کی استنادی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے مسلمان علما نے متعارف کروایا۔ ماضی کے واقعات کو پرکھنے کا یہ ایسا فن ہے جس سے

واقعات کی صحیح ترین تصویر حاصل کی جاسکتی ہے۔(۱۲) علم سیرت کا یہ پہلو سب سے زیادہ اہم ہے، کیوں کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلومات بہ جائے پرانی ہونے کے مزید نکھر کر اور نتھر کر ہمارے سامنے آئی ہیں اور جیسے جیسے سیرت کا مطالعہ وسیع ہوتا جارہا ہے مزید پہلو نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ سیرت کے اس پہلو کی نمایاں بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دنیا میں کسی نامور شخصیت کے حالات زندگی اس کمیت اور صحت سے موجود نہیں اور نہ کوئی ایسی شخصیت موجود ہے جس کی زندگی پر آئے روز کسی نہ کسی پہلو سے کام ہورہا ہو۔ اس لحاظ سے سیرت کا یہ پہلو غیر مسلموں کے لئے بہت ہی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کیوں کہ جن شخصیات کے دوسرے مذاہب پیروکار ہیں ان کی زندگی کے متعلق بنیادی باتیں بھی فراہم ہونا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اگر آج کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی طرح کا لباس پہننا چاہے تو اسے مایوسی ہوگی کہ ایسی کسی قسم کی معلومات انجیل میں بھی میسر نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض مغربی مصنفین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کے بارے میں ہی شک کا اظہار کیا ہے اور انہیں ایک خیالی شخصیت قرار دیا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایسی بات کوئی دشمن بھی کہنے کی جسارت نہیں کرتا کہ ان کی شخصیت تاریخ سے ثابت نہیں۔ البتہ علم سیرت کی استنادی حیثیت کے متعلق مستشرقین مختلف قسم کے اعتراضات آئے روز قائم کرتے رہتے ہیں لیکن اس کا محرک تعصب کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ زمانہ قدیم کے بہت سے ایسے کردار ہیں، جن کے بارے میں نہایت مبہم معلومات پائی جاتی ہیں مگر مغربی تاریخ دان ان کی زندگی کے بارے میں معلومات کو حرف آخر کی طرح مانتے ہیں لیکن سیرت جیسے مضبوط علم پر اعتراضات کا سلسلہ دراز کئے ہوئے ہیں۔(۱۳)

موجودہ دور کے مسائل کے حوالے سے سیرت سے جو رہ نمائی حاصل کرنے کا کام شروع ہوا اس نے غیر مسلموں کے لئے سیرت کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بالکل نئے سرے سے ایک انقلاب اور بھرپور اصلاح کی نوید سنائی اور اسے اپنی زندگی کے ہی آٹھ سال کے قلیل عرصے میں نہ صرف مکمل کر کے دکھایا بل کہ جو رول ماڈل دنیا کے سامنے پیش کیا وہ زندگی کے ہر گوشے کے لئے آج بھی اسی طرح سے معنویت رکھتا ہے جس طرح کی معنویت روز آغاز میں رکھتا تھا۔ سیرت مبارکہ کی یہ جامعیت ہی اسے انفرادیت عطا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا ایک جامع رول ماڈل ہونا اور اس سے جدید دور میں بھی سیرت نگاروں کا رہ نمائی حاصل کرنا ایک ایسی منفرد چیز ہے جو دنیا میں کسی اور شخصیت کو حاصل نہیں۔ اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ دنیا کے کام یاب ترین انسان ٹھہرتے ہیں اس کا اعتراف مغربی مصنفین بھی کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے لئے سیرت کا ایک اہم پہلو اس کا تہذیبی کردار ہے۔ اسلامی تہذیب کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے مدینے میں ایک اسلامی معاشرے کے قائم کرنے سے ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ ایک عالم گیر صورت اختیار کر لی۔ اسلام سے قبل ہر بڑی تہذیب کی بنیاد کوئی نہ کوئی مذہب تھا۔ اسلامی تہذیب ان مذاہب کی اصل تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ یہ بات قرآن میں بھی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے بارہا کہی کہ میں کوئی نیا دین لے کر نہیں آیا بل کہ پہلے انبیا کی دعوت کا تسلسل اور کمال پیش کر رہا ہوں۔ اس حوالے سے اسلامی تہذیب جامع الحضارات ہے۔ مختلف انبیا کی صفات کو رسول اللہ ﷺ کی ذات مین یک جا دیکھا جاسکتا ہے۔ (۱۴) اور مختلف آسمانی صحیفوں کی خصوصیات کو قرآن میں یک جا کر دیا گیا ہے۔ (۱۵) اس میں قانون بھی ہے، مناجات بھی، تاریخ بھی اور عقائد بھی۔ اسلام کے غلبے کے لئے اسی تہذیب کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد سیرت رسول ﷺ ہے۔ لہٰذا ضرورت سیرت کی تعلیم کو عام کرنے کی ہے۔ اس سے معاشرے میں اخلاقیات کو فروغ ملے گا جس سے اسلامی معاشرت کی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور یہ اسلامی تہذیب کے غلبے کی صورت بنے گی۔ ایسی اسلامی تہذیب پر قائم ہونے والی حکومت عالم گیریت کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک منصفانہ حکومت کا قیام اسی طرز پر کیا۔ دور حاضر میں اسلام کو حکومت کے ذریعے نافذ کرنے کی کوششیں عبث ثابت ہوں گی جب تک مکارم اخلاق کا عمل ادھورا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مطالعہ سیرت دنیا کی ایک روحانی ضرورت بھی ہے۔ روحانیت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خالق کے ساتھ تعلق کو مضبوط کیا جائے اور بعض نظریات کے مطابق اپنی ہستی کو خالق کی ہستی میں فنا کر دیا جائے۔ یہ جتنا بڑا مقصد ہے اتنا ہی بڑا مسئلہ بھی کہ خالق کے ساتھ تعلق کو کس طرح سے مضبوط کیا جائے۔ اس کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے گئے، کہیں مظاہر کی پرستش کی گئی اور کہیں صفات کا دامن تھاما گیا لیکن ہر طریقے میں خالق کے قرب کو وہی محسوس کر سکتا ہے جو ایک خاص روحانی عمل سے گزرے۔ عوام الناس بس ایسے شخص کے چرن چھو کے یا اس کی کچھ خرق عادات کا مشاہدہ کر کے ہی روحانیت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام نے روحانیت کے لئے ایک ایسا انسانی نمونہ پیش کیا جسے ہر انسان اختیار کر کے اللہ کا قرب اور اس کی محبت حاصل کر سکتا ہے۔ نہ صرف اختیار کر سکتا ہے بل کہ ایک متبع سنت کو دیکھ کر اس احساس کا ادراک بھی کر سکتا ہے جو متبع سنت شخص کے سینے میں موج زن ہے۔ اسلام کی ساری روحانی تعلیم کا اصل الاصول ہی یہ ہے کہ ذات رسالت مآب ﷺ کا اتباع کامل اور آپ کی ذات گرامی سے محبت ذات باری تعالیٰ سے محبت کا مظہر ہے۔ (۱۶) اور اس اتباع کے لئے کسی خاص روحانی تجربے سے گزرنے کی ضرورت نہیں: رسول اللہ ﷺ کی سنت مطالعہ سیرت کی وسعت کے باعث روز روشن کی

طرح عیاں ہے۔اس کی روشنی صرف مطالعہ کرنے سے ہی اس قدر محسوس ہوتی ہے اگر اسے اپنالیا جائے تو روحانیت کا کیا عالم ہوگا؟

باب دوم: سیرت اور علوم سیرت۔ایک تعارف ایک جائزہ

مطالعہ سیرت کی ضرورت اور اہمیت کی وضاحت کے بعد اب سیرت کے نفسِ مضمون کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔موجودہ بحث سیرت کے مختلف موضوعات (جو مختلف علوم کے حوالے سے قائم کئے گئے ہیں) اور ان کی جامعیت اور وسعت سے متعلق ہے۔اسی وسعت کو مزید واضح کرنے کے لئے مصادر علم سیرت پر بھی اختصار سے گفت گو کی جائے گی۔

اس سے پیش تر بیان ہو چکا ہے کہ سیرت کا آغاز اسلامی معاشرے اور ریاست کی قانونی ضرورت کے تحت ہوا، جسے اولاً سیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا اور حب رسول کے جذبے کے تحت رسول اللہ ﷺ کی بقیہ زندگی کی معلومات کو بھی صحابہ کرام اور بعد کے علمائے کرام نے مرتب کیا۔حضور علیہ السلام کے ارشادات، آپ کی سنت، آپ کے مکاتیب، پھر آپ کے آباؤ اجداد اور خاندان: اس سے بھی آگے آپ کا قبیلہ اور دوسرے قبائل سے رشتہ داریاں اور آپ کے شمائل۔صرف یہیں تک نہیں بل کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے بھی مختلف طبقات تجویز کئے گئے۔(۱۷) علاوہ ازیں نبوت کے بعد از طبیعاتی پہلو، جن میں معجزات وغیرہ کی بحث آتی ہے، بھی سیرت کا حصہ ہیں۔(۱۸)

شروع سے لے کر آخر تک سیرت نگاروں کا یہ اسلوب رہا ہے کہ حیات مبارکہ کی تفصیلات آپ ﷺ کے خاندان اور آباؤ اجداد سے شروع کی جاتی ہیں۔یہ تفصیلات صرف ان کے بہ راہ راست آباؤ اجداد تک محدود نہ تھیں بل کہ آباؤ اجداد کے قریبی رشتہ دار و اقارب، پھر جہاں جہاں ان آباؤ اجداد کی شادیاں ہوئیں، ان کے سسرالی رشتہ داروں، اور ان کی نانیوں اور دادیوں سب کے بارے میں محققین نے الگ الگ تفصیلات جمع کی ہیں۔عربوں میں چوں کہ قبل از اسلام ہی علم انساب رائج تھا، لہٰذا اس چیز نے سیرت نگاروں کے لئے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ محفوظ رکھا جو وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ قابل اعتماد بھی تھیں۔(۱۹) محدثین اور سیرت نگاروں کی چھان پھٹک نے ان معلومات کو درجہ استناد تک پہنچا دیا اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔رسول اللہ ﷺ کے نسب کا بیان اس لئے بھی اہمیت اختیار کر گیا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کا کئی مواقع پر ذکر فرمایا۔ایک مقام پر آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراھیمؑ کی نسل میں سے بنی اسماعیل کو چنا، بنی اسماعیل میں سے قریش کو چنا، قریش میں خاندان بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں

مجھے منتخب کیا۔ عربوں کا انساب اس حقیقت کی گواہی دیتا تھا اس لئے کسی نے کبھی اس کا رد نہیں کیا۔

ایک اور حوالہ سے بھی رسول اللہ کا نسب اہمیت کا حامل تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں سے کئی شخصیات شہر مکہ میں ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ سب سے پہلے تو حضرت اسماعیلؑ کعبہ کے والی تھے اور ان کے بعد یہ منصب ان کی اولاد میں رہا، حتیٰ کہ بنو جرہم نے ۲۰۷ء میں ان سے یہ منصب چھین لیا۔ اسے دوبارہ بنی عدنان (۲۰) (آل اسماعیل) کے لئے قصی بن کلاب نے ۴۴۰ء میں حاصل کیا جو رسول اللہ ﷺ کی چھٹی پشت پر تھے۔ ان ہی نے شہری مملکت مکہ کی بنیاد رکھی اور اس کے مختلف شعبوں کو قریش کے مختلف قبائل میں تقسیم کیا۔ (۲۱) اب کعبہ کی تولیت کے ساتھ مکہ شہر کی ولایت بھی رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں آ گئی۔ ان کے بعد ان کے پوتے (رسول اللہ ﷺ کے جد امجد) ہاشم نمایاں شخصیت تھے۔ انہوں نے عرب کے مختلف قبائل سے معاہدات کر کے قریش کے لئے تجارتی سفر کو محفوظ کیا۔ قیصر روم سے بھی ان کی ملاقات کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب ان کے جانشین ہوئے۔ آخری عمر میں یہ غار حرا عبادت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ ابرہہ کا مکہ پر حملہ ان ہی کے دور میں ہوا تھا۔

ان کے علاوہ بھی رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں مشہور لوگ گزرے ہیں۔ ان میں نضر بن کنانہ ہیں۔ ان سے بھی قریش کا لقب منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک شخصیت کعب بن لوئی کی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر تھے اور حضرت عیسیٰ کے بعض حواریوں سے ان کی ملاقات کے اشارے ملتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ قریش کو جمعہ کے دن جمع کر کے انہیں رسول اللہ ﷺ کے آنے کی خوش خبری سنایا کرتے تھے۔ (۲۲) یہ وہ لوگ تھے جن کے حالات مکہ کے لوگوں کے لئے اجنبی باتیں نہیں تھیں لہٰذا سب جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔

نسب کے بعد رسول اللہ کے حلیہ مبارک کے بارے میں بھی صحابہ کرامؓ نے بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ (۲۳) آپ ﷺ کے حلیے کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن سب سے پہلے امام ترمذی نے ان تفصیلات کو ایک کتاب کی شکل میں قلم بند کیا جو شمائل ترمذی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ایک درجن سے زیادہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کے حلیے مبارک کو بعد والوں کے لئے بیان کیا ہے۔ ان میں حضرت علیؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ہند بن ابی ہالہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (۲۴)

شمائل کے بعد سیرت کا جو میدان سامنے آتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے خطبات اور تقاریر ہیں جو آپ نے مختلف مواقع پر ارشاد فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے خود اپنے فرمان کے مطابق آپ افصح العرب

تھے اور آپ کی فصاحت کو آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے خطبات کے ایک درجن سے زائد مجموعے ہیں جنہیں سیرت نگاروں نے مرتب کیا ہے۔ اردو زبان میں ایک بڑا مجموعہ مولانا محمد محدث جوناگڑھی نے مرتب کیا ہے۔ عربی زبان کے علاوہ اس تفصیل کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ رسول اللہ ﷺ نے کئی مواقع پر خطبات ارشاد فرمائے جو اپنے اپنے تناظر میں اہمیت کے حامل ہیں۔ سب سے پہلا خطبہ کوہ صفا پر ارشاد فرمایا جس میں قریش کے اہم ترین افراد کو اسلام کی دعوت دی اور سب سے آخری خطبہ اپنی وفات سے چند روز پہلے ارشاد فرمایا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم خطبہ حجۃ الوداع ہے جو انسانی حقوق کا سب سے پہلا اور سب سے جامع منشور اعظم ہے۔ (۲۵) صرف اسی ایک خطبے پر کئی پہلوؤں سے لکھا گیا ہے۔ خطبات کی تفصیل کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کا انداز خطابت بھی اسی موضوع کا حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ خطبہ ٹھہر ٹھہر کر وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے، جہاں ضرورت ہوتی اہم نکات کی تکرار بھی فرماتے۔ بات پر زور دینے کے لئے ایک بات کو تین مرتبہ دہرانا رسول اللہ ﷺ کا خاص انداز تھا۔ اکثر روایات کے آخر میں لکھا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ وضاحت کے لئے ہاتھ اور انگلیوں سے اشارہ بھی کرتے جسے ہر روایت کرنے والا اسی طرح اپنے سامع کو نقل کر کے دکھاتا۔ (۲۶) بعض دفعہ رسول اللہ ﷺ مثال دے کر بات سمجھاتے۔ لوگوں نے امثال النبی پر الگ سے کتابیں لکھیں ہیں۔ یہ بھی ہوتا کہ قرآن کے اسلوب کی طرح پہلے بات کو اجمالاً بتاتے پھر تفصیلاً۔ یا پھر سوالیہ انداز میں مسئلہ بیان کرتے تاکہ سننے والا بات کی طرف متوجہ ہو جائے، پھر اس کا جواب خود عنایت فرماتے۔ علاوہ ازیں آپ مخاطبین کے درجات کے لحاظ سے ان کو الگ الگ خطاب بھی کرتے۔ یہ سارے وہ پہلو ہیں جو حضور علیہ السلام کے خطبات اور ارشادات پر غور کرنے والوں نے دریافت کئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے املا کروائی ہوئی دستاویزات اور وثائق بھی سیرت کا ایک اہم موضوع ہیں۔ معاصر فرمانرواؤں کو دعوتی و تبلیغی خطوط، قبائل سے معاہدات اور ان کی تجدید، عمال کے تقرر نامے اور ان کے نام انتظامی احکامات (۲۷)، زمینوں اور مال گزاری کے متعلق احکامات (۲۸)، شخصی خطوط وغیرہ ان دستاویزات کا حصہ ہیں۔ یہ دستاویزات حدیث، تاریخ اور فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتی ہیں۔ ان میں پائے جانے والی ہدایات کے باعث ان کی فقہی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں سیرت نگاروں نے ان دستاویزات کو الگ مجموعوں کی شکل میں تالیف کیا۔ مکاتیب نبوی پر سب سے پہلی کتاب برصغیر کے ایک عالم شیخ ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی نے چوتھی صدی ہجری میں لکھی۔ یہ دیبل کے رہنے والے تھے جو کراچی کا پرانا نام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دسویں صدی

ہجری کے ایک سیرت نگار محمد بن علی ابن طولون نے مکاتیب نبوی پر ٹھوس کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی عربی اور اردو میں تحریری مواد موجود ہے۔ جامع ترین مجموعوں میں ایک برصغیر کے ڈاکٹر حمید اللہ کا ''الوثائق السیاسیۃ فی العھد النبوی والخلافۃ الراشدۃ'' ہے جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔

وثائق کے ساتھ منسلک ایک موضوع ان وثائق کی کتابت کرنے والوں کا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ تو کاتبین وحی کا تھا، یہ زیادہ تجربہ کار لوگوں پر مشتمل تھا۔ دیگر دستاویزات کے لئے، جن کا تذکرہ ہورہا ہے، کم تجربہ حضرات کی خدمات بھی لے لی جاتی تھیں۔ ان کاتبین پر علما نے کتابیں تحریر کی ہیں، جو سیرت کا حصہ ہیں۔ (۲۹) یہ دستاویزات مسلمانوں کے لئے تقدس کا درجہ رکھتی تھیں اور جن قبائل یا خاندانوں کو رسول اللہ ﷺ نے ایسی کوئی دستاویز دی تھی وہ اس کی بڑی حفاظت کرتے تھے۔ (۳۰) لہٰذا اس میں جعل سازی کا خدشہ بھی رہتا تھا۔ ایسی جعل سازیوں کو محدثین نے طشت از بام کیا۔ اس بنا پر اب اصل دستاویزات میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں پایا جاتا۔ (۳۱)

خطبات اور دستاویزات سے متعلق ایک اور موضوع ادبیات کا ہے، جس میں ماہرین نے یہ جائزہ لیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا عربی زبان کے اسلوب پر کیا اثر پڑا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم ترین جو مواد ملتا ہے وہ جاحظ کے ہاں ملتا ہے جس نے ''البیان والتبین'' میں ایک مفصل باب میں رسول اللہ ﷺ کی ادبیات، زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کے بارے میں گفت گو کیا ہے۔ اس موضوع کو ادبیات سیرت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ منظوم سیرت کا موضوع بھی اسی ضمن میں آئے گا۔ بعد میں یہ انداز فارسی اور اردو میں بھی اپنایا گیا۔ اردو میں حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' اسی صنف سے متعلق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اصل کام تو اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا تھا لیکن بعض دفعہ آپ نے ایسے امور میں بھی امت کی رہ نمائی فرمائی جو بہ راہ راست رسالت کے منصب سے متعلق نہ تھے۔ ان امور میں ایک میدان طب کا بھی ہے۔ آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً طب ابدان کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی رہ نمائی فرمائی۔ حفظان صحت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی بیش تر ہدایات کی جدید میڈیکل سائنس بھی تصدیق کرچکی ہے۔ اسی حوالے سے پاکستان کے ماہر طب ڈاکٹر خالد غزنوی نے کئی جلدوں پر مشتمل ''طب نبوی اور جدید سائنس'' لکھی ہے۔ اس کے علاوہ سیرت کی جامع کتابیات میں جو ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے مرتب کی ہے، پچیس کتب طب نبوی سے متعلق ہیں اور یہ تمام عربی میں ہیں۔ لہٰذا یہ بھی سیرت کا ایک موضوع ہے۔ فقہی حوالے سے اس پر مزید بات فقہیات سیرت کے ضمن میں ہوگی۔

عوام الناس کے لئے سیرت کو آسان فہم بنانے کے لئے مختصر رسالے اور کتابچے لکھنے کا سلسلہ شروع

ہوا، تا کہ عام لوگ سیرت کے بنیادی حقائق سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ اسے ہم لوک سیرت کا نام دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میلاد ناموں اور موالید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ولادت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے بیان میں ان معجزات اور بشارتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو آپ کی پیدائش سے متعلق ہیں۔ میلاد ناموں کا آغاز پانچویں صدی ہجری سے ہوا۔ (۳۲)

اسلام میں علم اور تعلیم کو اہم مقام حاصل ہے۔ تعلیم ایک تو شریعت کا ضروری حصہ ہے اور یہ شریعت چوں کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے منسلک ہے، لہٰذا سیرت کا ایک موضوع تعلیمیات کا بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے تعلیم کے بارے میں طرز عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک چیز تو خود رسول اللہ ﷺ کا بہ طور معلم کردار ہے۔ بہ طور معلم مبعوث ہونے کے تقاضے جو انہوں نے نبھائے وہ کیا تھے، اس پر بھی الگ سے کتابیں لکھی گئیں اور یہ تعلیمیات سیرت کے تحت آتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس موضوع کے تحت وہ فیصلے اور انتظامات آتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے صادر فرمائے۔ مکے میں تعلیم کا کیا نظام تھا، مدینہ میں کیا ہوا وغیرہ۔ ان موضوعات پر ریاست مدینہ کے ضمن میں بھی بات ہوگی۔

سیرت کا ایک اہم موضوع روحانیات کا ہے جس سے مراد تزکیہ نفس کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایات ہیں۔ ان کا بہ راہ راست تعلق تو حدیث اور سنت سے ہے لیکن الگ سے سیرت کے حوالے سے بھی اسے دیکھا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے نفوس کے تزکیے کے لئے کیا راہ عمل اختیار کی، یہ روحانیات سیرت کا موضوع ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز رسول اللہ ﷺ کی سکھائی ہوئی دعائیں اور مناجات ہیں جو رب العزت سے بندے کے قرب کا باعث بنتی ہیں، جس سے تزکیہ نفس کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں پر سیکڑوں مجموعے تیار ہوئے ہیں جو سیرت کے اس موضوع کا حصہ ہیں۔ دعاؤں کے سلسلے میں حضور یہ اہتمام فرمایا کرتے تھے کہ یہ من وعن صحابہ کو یاد ہوں نہ کہ بالمعنی۔ (۳۳)

اسلامی تصوف کے سلسلے بھی روحانیات سیرت کے تحت آتے ہیں جو مختلف صحابہ کرامؓ کے ذریعے رسول اللہ ﷺ تک پہنچتے ہیں۔ (۳۴) شاہ ولی اللہ کے ادراک کے مطابق یہ سلسلے رسول اللہ کی خلافت باطنہ ہیں (۳۵) جو کبار صحابہ کرام کو بہ راہ راست تفویض ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی حقیقی نیابت یہی ہے جو تزکیہ نفس سے عبارت ہے۔ اہل تصوف نے جب ان سلسلوں کو منظم کیا تو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو تصوف کی اصطلاحات میں بیان کیا۔ لہٰذا نور محمدی، حقیقت محمدیہ، برزخ کبری، یہ تصوف کے بڑے بڑے موضوعات ہیں جن پر اکابر صوفیا نے بہت کچھ لکھا ہے، یہ روحانیات سیرت کے ضمن میں آتے ہیں۔ روحانیات سیرت کا زیادہ تر مواد کتب تصوف سے اخذ کیا جاسکتا ہے، جب کہ سیرت نگاروں نے اسے

زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کیا جس کا باعث اہل تصوف کا الگ مزاج اور الگ میدان ہونا ہے۔

روحانیات کی ایک اور ضمنی بحث انبیا علیہم السلام کے تقابل کی ہے لیکن یہ ایک نازک موضوع ہے اور سمندر کی گہرائی میں خزینے تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ شیخ ابن العربی کی فتوحات مکیہ اس سلسلے میں بہت اہم کتاب ہے۔ حقیقت موسوی، عیسوی اور محمدی کے مباحث تہذیبوں کے مزاج کا اندازہ لگانے کو ایک سمت مہیا کرسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا ایک تبصرہ بڑا بے لاگ ہے کہ All the previous prophets were Muahammad in making اسی بحث سے ملتا جلتا ایک موضوع دلائل نبوت کا ہے جو کہ علم کلام سے متعلق ہے لیکن سیرت سے بھی بہ ہر حال اس کا تعلق ہے اور سیرت نگاروں نے اس ضمن میں بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ اس موضوع میں خاص طور پر معجزات اور وحی کی نوعیت کی بحث آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مدح بیان کرنے کو بھی مسلمان بڑے اجر والا کام سمجھتے ہیں جس سے مدائح نبوی کا ایک موضوع سامنے آتا ہے۔ یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک جاری وساری ہے اور ہر شاعر اپنی مقدور بھر کوشش اس میں صرف کرتا رہا ہے۔ بعض روایات کے مطابق آپ کے دادا عبدالمطلب اور چچا ابوطالب نے بھی رسول اللہ ﷺ کی تعریف میں اشعار کہے تھے۔ برصغیر کی روایتی عقیدت مندی کے باعث اردو اور فارسی زبان کا دامن مدائح نبوی کے سلسلے میں عربی سے بہت زیادہ وسیع ہے۔

سیرت کا ایک موضوع نفسیات کے حوالے سے بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین اور اس کے نفاذ کے سلسلہ میں لوگوں کے ذہنی وقلبی رجحانات کو کس طرح سے پیش نظر رکھا۔ سیرت نگاروں نے اس بارے میں خصوصی طور پر تو نہیں لکھا لیکن ضمناً اس بات کا جابہ جا ذکر کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی بات ارشاد فرمائی یا کوئی حکم صادر کیا تو اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما تھی۔ اس سلسلے میں ایک اہم چیز تدریج ہے کہ امور کو تدریجاً طے کیا گیا۔ کسی چیز کی ممانعت کرنی ہو یا کسی چیز کو جاری کرنا ہو اس میں تدریج کے حکیمانہ نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھا گیا۔ اپنے ماضی سے یک دم لاتعلق ہو جانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، خاص طور پر ایسے امور جن پر فخر جتایا جاتا ہو۔ اس سلسلے میں شراب کی ممانعت قابل غور ہے جو پورے عرب میں فخریہ رائج تھی۔ (۳۶) اس کے علاوہ بعض مواقع پر مخالفت کی شدت کم کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے۔ مثال کے طور رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیانؓ کی بیٹی سے شادی فرمائی، فتح مکہ کے موقع پر ان کے گھر کو دارالامان قرار دیا گیا وغیرہ۔ بعض دفعہ صحابہؓ کی جانب سے کسی نامناسب اقدام کے ردعمل کا سدباب کرنے کے لئے فوری فیصلے صادر فرمائے۔ مثال کے طور پر فتح مکہ ہی کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہؓ، نے جو ایک دستے کے کمان دار تھے، جوش کے غلبے میں کہہ دیا کہ آج حرمتیں ختم ہو جائیں گی تو اس کے

عواقب سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ سعدؓ کو بھی کوئی شکایت نہ رہی۔ آپ ﷺ نے ان سے علم لے کر بیٹے کو دے دیا۔ اسی طرح کئی مواقع پر صحابہ کرامؓ کی متوقع بدگمانی کے سدباب کے لئے حضور نے حسن تدبیر اختیار کی۔ (۳۷) یہ سب نفسیات سیرت کے موضوع ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات ایک وسیع تاریخی اور تہذیبی عمل کا حصہ ہے اور تاریخ وتہذیب کو جغرافیئے سے گہرا تعلق ہے، بل کہ جغرافیئے کے بغیر تاریخی عمل کو سمجھنا محال ہے۔ مختلف غزوات میں رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی، مختلف قبائل سے رابطے اور معاہدات کو سمجھنے کے لئے متعلقہ جغرافیہ کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ (۳۸) بعض قبائل کو کچھ مراعات دی گئیں بقیہ کو نہیں دی گئیں تو اس کی حکمت ان قبائل کے جغرافیائی حالات سے واضح ہوتی ہے۔ لہٰذا عرب کا جغرافیہ بھی، جہاں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے سیرت کا ایک اہم موضوع ہے جس پر سیرت نگاروں نے بہت لکھا ہے۔ اس پر تقریباً ایک درجن کے لگ بھگ کتابیں موجود ہیں۔ جغرافیہ سیرت پر قدیم ترین کام تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کی اوائل میں وائل بن حائک ہمدانی نے کیا۔ ان کی کتاب کا نام ''صفۃ جزیرۃ العرب'' ہے۔ اردو میں سید سلیمان ندوی کی ''ارض القرآن'' بہترین تصنیف ہے۔

یہاں تک تو ان موضوعات کی بابت گفت گو تھی جن پر بہت سا کام ہو چکا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے، سیرت کے بعض موضوعات ایسے ہیں جو جدید رجحانات کے تناظر میں سامنے آتے ہیں، لہٰذا مصادر سے ان کی تفصیلات کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں ایک موضوع اجتماعیات یا عمرانیات سیرت (sociology of sirah) کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دین کی اشاعت کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کیا اس میں اس وقت کے معاشرتی عوامل کس حد تک دخل رکھتے تھے، عمرانیات سیرت میں یہ بحث آئے گی۔ یہ پس منظر بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ (۳۹) آپ ﷺ کی بیش تر اصلاحات کی معنویت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک عرب کے معاشرے کو نہ سمجھا جائے۔

ان موضوعات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے متعلق اور آپ کے اپنے شخصی معاملات کے بارے میں جتنی معلومات جمع ہوسکتی تھیں وہ تابعین نے صحابہ کرام سے حاصل کر کے جمع کیں۔ بعض ایسی چیزوں کے بارے میں بھی معلومات جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا جن کی شاید سیرت یا اس کے پیغام کو سمجھنے میں اتنی اہمیت نہ تھی۔ مثال کے طور پر سیرت نگاروں نے رسول اللہ ﷺ کے نعلین مبارک کے بارے میں معلومات کو مرتب کیا اور ایک مشہور سیرت نگار کے مطابق جن لوگوں نے نعلین مبارک پر لکھا ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔

مصادر سیرت

سیرت کے موضوعات کے ساتھ مصادر سیرت کا ذکر بھی ضروری ہے جن سے ان موضوعات کو مرتب کیا جاتا ہے۔ جدید دور میں اس کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ ہوگئی ہے کہ مستشرقین نے ان مصادر کے بارے میں شدومد سے شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے اہم مصادر کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

سب سے اولیں ماخذ تو خود قرآن مجید ہے جس میں سیرت کے تمام ضروری واقعات کو صراحتاً اور اشارتاً دونوں طرح بیان کیا گیا ہے۔ مختلف پہلوؤں سے ان واقعات پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سیرت کے حوالے سے جو اصول بیان کئے ہیں وہ ابد تک مسلمانوں کے ایمان اور عمل کا حصہ بن گئے۔ قرآن میں سیرت کے واقعات کو مرتب کرنے کا کام بھی مسلمانوں نے کیا اور اس سلسلے میں ایک بہت اہم کام دکتور محمد عزت دروزہ کا ہے جو ''عصر النبی'' کے نام سے عربی میں ہے۔ انہوں نے سیرت کی ترتیب کے حوالے سے قرآن پاک کی آیات کو ترتیب دیا۔ اس کے علاوہ ایک نام ڈاکٹر لقمان اعظمی کا بھی ہے۔ اس اسلوب کے لئے ہم ''قرآنیات سیرت'' کی اصطلاح استعمال کرسکتے ہیں۔

معلومات کے اخذ کرنے میں قرآن کے بعد حدیث کا درجہ ہے، جب کہ کتب احادیث کی استنادی حیثیت کے حوالے سے آگے پھر کئی درجے ہیں۔ احادیث میں سیرت کے اہم ترین واقعات کی جزئیات کی حد تک تفصیلات موجود ہیں۔ لہٰذا بعض لوگوں نے صحیحین (بخاری ومسلم) کی بنیاد پر سیرت کے مجموعے مرتب کئے ہیں، بعض نے یہی کام بقیہ کتب احادیث کو ساتھ ملا کر کیا ہے۔ ایک محقق نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی ''فتح الباری'' سے جو صحیح بخاری کی بہترین شرح کے طور پر جانی جاتی ہے، بیان سیرت سے لے کر سیرت کی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ صحاح ستہ کے بعد سیرت کی مستند کتب میں مسند احمد، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، المعجم الکبیر للطبرانی اور مجمع الزوائد قابل ذکر ہیں۔ مصدر ہونے کے اعتبار سے کتب فقہ کو بھی اسی صف میں گنا جاتا ہے، کیوں کہ فقہ کی کتابوں کی بنیاد احادیث ہی ہیں۔ ان میں وہ کتابیں نسبتاً زیادہ اہم ہیں جو مالیات اور دوسرے انتظامی امور پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں امام یوسف کی کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم کی کتاب الاموال، ابوعبید کی کتاب الاموال، ابن زنجویہ کی کتاب الاموال اور ابونصر داؤدی کی کتاب الاموال قابل ذکر ہیں۔

حدیث اور کتب سیرت میں تداخل پایا جاتا ہے۔ کچھ تفصیلات تو ایسی ہیں جو حدیث اور سیرت دونوں سے یک ساں متعلق ہیں، لیکن کچھ مختلف ہیں کہ ایک میں زیر بحث آتی ہیں لیکن دوسری میں نہیں۔

یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ سیرت کا کوئی واقعہ ایسا ہو جس پر محدثین اور سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہو تو اس صورت میں کس کی رائے کو ترجیح دی جائے۔ جہاں تک معاملہ ہے شریعت اور عقائد کے مسائل کا تو اس میں تو اہل علم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ استناد کے اعلیٰ معیار کے پیش نظر محدثین کی بات کو مانا جائے لیکن اگر کوئی امر حکم شرعی کے زمرے میں نہیں آتا تو اس صورت میں بعض لوگوں کے خیال کے مطابق سیرت نگاروں کی رائے کو فوقیت دینی چاہئے۔ یہ اختلاف معمولی نوعیت کا ہوتا ہے، مثال کے طور پر کون سا غزوہ پہلے ہوا اور کون سا بعد میں وغیرہ۔ (۴۰)

اس کے علاوہ سیرت کے مصادر میں کتب سیرت اور مغازی ہیں جن کی تفصیل اگلے مضمون میں بیان کی جائے گی۔ ان کے بھی صحت اور ضعف کی بنا پر مختلف درجے ہیں۔ سیرت کی ہی ایک دوسری شکل جو مغازی سے شروع ہوئی اور بعد میں ایک الگ شعبے کی شکل اختیار کر گئی وہ تاریخ ہے۔ عربوں میں تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا لیکن گزرے وقت کے واقعات سینوں میں محفوظ کرنے کی روایت بہت پختہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں میں بعض معاملات ایسے پائے جاتے تھے جن کے لئے پرانے واقعات کا یاد رکھنا ایک ضرورت بھی تھی۔ ایسا ایک رواج منافرہ کا تھا جس میں دو فریقوں میں اس بنا پر فیصلہ کیا جاتا تھا کہ کس کے آباؤ اجداد کے کارنامے زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے اس فیصلے کے لئے جس پر کسی کو اعتراض بھی نہ ہو معلومات کی حفاظت بھی قابل اعتماد ہونا ضروری چیز تھی۔ یہ معلومات ڈھکی چھپی نہیں ہوتی تھیں بل کہ ان کا محفوظ کرنا عام بات تھی اس لئے اس فیصلے پر سب اعتماد کرتے تھے۔ (۴۱) اس سے وابستہ ایام کا ادارہ تھا جسے ایام العرب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عرب کی مشہور جنگوں کے واقعات جس میں لوگوں نے اپنی جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے تھے فخر و مباہات کے لئے بچے بچے کو یاد ہوتے تھے اور نسل در نسل چلتے تھے۔ یوم بعاث، یوم فجار، یوم ذی قار، بڑی بڑی جنگیں تھیں۔ اس کے علاوہ علم الانساب ہے جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا۔ گو یہ چیزیں لکھی ہوئی موجود نہ تھیں لیکن ان کا استناد کسی لکھی ہوئی چیز سے کسی طور بھی کم نہ تھا۔ اسلام نے اس روایت کو جاری رکھا اور قرآن کے حفظ کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی، جس کے نتیجے میں ہر دور میں بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان قرآن کے حافظ ہوتے ہیں۔ حافظ حدیث بھی پائے جاتے ہیں۔ بل کہ اصول یہ ہے کہ سینوں کا حفظ لکھے ہوئے کی تصدیق کرتا ہے۔ حدیث میں جو راویان کے حالات محفوظ کرنے کا طریقہ ہے وہ بھی عربوں کی اسی روایت کا تسلسل ہے۔ مسلمانوں نے حفظ کے ساتھ اسے تحریری شکل بھی دی اور تاریخ کی ایسی شکل سامنے آئی جس کے سامنے جدید تاریخ نویسی کے اصول بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ (۴۲)

اسلام میں سب سے پہلی تاریخ عبید بن شریہ نے لکھی جو حضرت امیر معاویہؓ کے عہد کے تھے لیکن ان کی کتاب آج موجود نہیں۔ اس کے بعد ابن جریر طبری کا کام بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ بعد کی تمام تواریخ زیادہ تر معلومات تاریخ طبری سے ہی اخذ کرتی ہیں۔ ایک اور قدیم مورخ ہیں جن کا نام خلیفہ بن خیاط ہے۔ ان کی تاریخ آج بھی موجود ہے اور مستند ترین مانی جاتی ہے۔ یہ امام بخاری کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ دیگر قابل ذکر مورخین میں یعقوبی، مسعودی، ازرقی شامل ہیں۔ اسلامی تواریخ کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک جاتی ہے جو اس وقت موجود ہیں۔

انساب کا اس سے قبل ذکر ہو چکا۔ عرب میں اب بھی انساب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو قدیم ترین مصنفین ہیں ان میں بلاذری، زبیر بن بکار، سمعانی اور ابن حزم شامل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور معتبر بلاذری کی انساب الاشراف ہے۔ انساب پر حضرت عمر نے خاص طور پر زور دیا اور جب تنخواہوں اور وظیفوں کے لئے دیوان مرتب فرمایا تو ان کو قبائل کی بنیاد پر مرتب کروایا۔ سیرت نگار انساب سے سیرت کے لئے معلومات اخذ کرنے کا اتنا ہی اہتمام کرتے تھے جتنا کہ وہ دیگر مصادر سیرت سے کرتے۔

سیرت کا ایک اہم مصدر کتب ادب ہیں۔ عربی اپنی فصاحت و بلاغت میں بہت اونچا درجہ رکھتی ہے، لہٰذا بیان کے اعلیٰ ترین نمونوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ قبل از اسلام اس حفظ کا مقصد جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی، فخر و مباہات تھا لیکن اسلام کے بعد اس حفاظت کا مقصد قرآن پاک کی زبان کی حفاظت، قرآن پاک کے اسالیب کو سمجھنے میں مدد اور قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ کرنا قرار پایا۔ حضرت عمرؓ نے بہ طور خاص اس کی تلقین فرمائی کہ لوگ اپنے بچوں کو شعر و ادب کی تعلیم ضرور دیں، کیوں کہ ان کے مطابق فان الشعر دیوان العرب ''شعر عربی زبان کی تاریخ کا مجموعہ ہے'' صحابہؓ میں سب سے زیادہ شعر سے دل چسپی رکھنے والے حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ (۴۳) وہ قرآن فہمی میں عربی ادب سے بہت مدد لیا کرتے تھے۔ ان کتب میں جگہ جگہ ایسی معلومات بکھری پڑی ہیں جو سیرت کے حوالے سے مفید ہیں۔ ان سے خاص طور پر قبائل کا پس منظر واضح ہوتا ہے جن سے رسول اللہ ﷺ نے وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے معاملات کئے۔ اس طرح سے یہ اجتماعیات سیرت میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان میں ابوالفرج اصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

کتب لغت بھی سیرت کا ایک اہم مصدر ہیں۔ جب عربی قاموس نویسوں نے لغت کے مجموعے تیار کئے تو بعض مشکل الفاظ کی شرح میں انہوں نے کچھ ایسی تفصیلات بھی بیان کیں جن کا تعلق سیرت سے تھا۔

مثال کے طور پر ''لسان العرب'' میں جگہ جگہ سیرت کے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ پھر کتب رجال بھی سیرت کا اہم ماخذ ہیں۔ محدثین نے جب راویوں کے حالات محفوظ کرنے شروع کئے تو سب سے پہلے صحابہ کرام کے تذکرے مرتب ہوئے، پھر تابعین کے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا گیا۔ صحابہ کرامؓ کے تذکروں سے سیرت کی اہم معلومات میسر آتی ہیں۔

سب سے آخر میں ہم کتابیات سیرت کی بات کریں گے۔ سیرت کے اس سارے ذخیرے پر کتابیات بھی شروع سے مرتب ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام ابن ندیم نے ''الفہرست'' لکھ کر کیا۔ موجودہ دور میں ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے المعجم، الف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ایک ضخیم کتاب تیار کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایرانی عالم عبدالجبار الرفاہی نے ایک کتاب فراہم کی ہے جو گیارہ جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کی گیارہویں جلد کا جو آخری اندراج ہے وہ ۲۹ ہزار ۷ سو ۹۴ ہے۔ (۴۴)

باب سوم: علم سیرت۔ آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع

علم سیرت کی ضرورت واہمیت اور تفصیلی تعارف کے بعد اس کے آغاز وارتقا کی وضاحت کا مرحلہ آتا ہے۔ علم سیرت کی تدوین اور ارتقا کے مختلف ادوار متعین کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تعین حتمی نہیں ہے بل کہ ان میں خاصا تداخل بھی پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ ایک دور فلاں سن سے شروع ہو کر فلاں سن میں ختم ہو گیا، قطعیت کے ساتھ درست نہ ہوگا بل کہ یہ اندازاً بات ہوگی۔ لہٰذا پہلا دور صحابہ کرام تک گنا جاتا ہے۔ یہ سیرت کی معلومات کی جمع اور فراہمی کا دور ہے۔ اس کے دو مرحلے ہیں، پہلا مرحلہ تو رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ ہم علم الانساب کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے اجداد کے بارے میں معلومات محفوظ رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی کئی مرتبہ ان معلومات کی تصدیق کی۔ یہ مرحلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک رہا۔ اور دور کا دوسرا مرحلہ صحابہ کرامؓ کا ہے جنہوں نے سیرت کی معلومات اپنے سے بعد والے لوگوں کو پہنچائیں۔ (۴۵) دوسرا دور تابعین اور تبع تابعین کا ہے (۴۶)۔ یہ سیرت کی تدوین اور ترتیب کا دور ہے۔ اس میں زبانی جمع شدہ معلومات کو بڑے پیمانے پر تحریری شکل میں لایا گیا، جس سے ان معلومات کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ تیسرا دور سیرت کی تصنیف وتالیف کا دور ہے جس میں سیرت پر مفصل کتابیں لکھی گئیں اور اسے ایک منظم علم کے طور پر مرتب کیا گیا۔ یہ دور چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک شمار کیا جاتا ہے۔ چوتھے دور کو استیعاب اور

استقصا کا دور کہا جاسکتا ہے۔(۴۷) اس دور میں تمام قسم کے ماخذوں سے سیرت کے بارے میں معلومات کو اخذ کر کے بڑے بڑے مجموعے ترتیب کئے گئے جو کئی کئی جلدوں پر مشتمل تھے۔ یہ دور چھٹی صدی ہجری کے اختتام تک گنا جاتا ہے۔ پانچواں دور ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر آج سے قریباً ڈیڑھ دوسو سال قبل تک کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں سیرت کے ذیلی موضوعات پر الگ الگ اور باقاعدہ کتب تحریر کی گئیں، جس کی تفصیل پچھلی بحث میں دی جا چکی۔ چھٹا دور انیسویں صدی عیسوی کے نصف سے شروع ہوتا ہے اور اسے تجدید سیرت کا دور کہتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں مغربی دانشوروں نے، جن کے لئے مستشرقین کی اصطلاح قائم کی گئی، سیرت کا مطالعہ شروع کیا اور اس پر بے شمار قسم کے اعتراضات اٹھائے جو پہلے کبھی کسی نے نہ اٹھائے تھے۔ لہٰذا ان سوالات کے جوابات کے ضمن میں سیرت کی نئی جہتیں متعین ہوئیں اور نئے نئے پہلو سامنے آئے۔ اسی لئے اسے تجدید سیرت کا دور کہا جاتا ہے۔ سیرت کے حوالے سے اس سے اگلا دور مستقبل کا ہے جس میں سیرت کے حوالے سے بے شمار چیلنجز مسلم امہ کو درپیش ہیں۔ سیرت کے آغاز، تدوین، ارتقا اور توسیع کی مرحلہ وار تفصیل درج ذیل ہے۔

اس سے پیش تر بیان ہو چکا کہ سیرت کے متعلق تمام بنیادی باتیں قرآن میں موجود ہیں اور یہ سیرت کا اولین ماخذ ہے لہٰذا تدوین سیرت کا پہلا مرحلہ تدوین قرآن ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے بہتر ہوگا کہ تدوین قرآن کے مراحل پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

قرآن مجید کی کتابیات اس کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔(۴۸) جیسے ہی قرآن کا نزول ہوتا رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو بلا کر لکھوا دیا کرتے۔ صحابہ اپنے پاس دست یاب مختلف چیزوں، مثلاً لکڑی، پتھر کی تختیوں اور اونٹ کے کندھے کی ہڈیوں، پر اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہ سارے پرزے اور پرچے (جن پر قرآن لکھا ہوتا) لے جایا کرتے اور قرآن کو اس کی ترتیب کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں خاص اہتمام سے صحابہ سے آپ ﷺ قرآن سنتے اور اگر کہیں کوئی غلطی ہوتی تو درست فرما دیتے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے اور آخری رمضان میں آپ نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل سے پورے قرآن کا دور کیا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی وفات سے قبل پورا قرآن صحابہ کرام کو مرتب شکل میں یاد تھا اور مختلف صحابہ کرامؓ کے پاس مجموعوں کی شکل میں مختلف چیزوں پر لکھا ہوا بھی موجود تھا۔ قرآن کی یہ ترتیب حفظ میں تو محفوظ تھی لیکن تحریر منتشر اجزا پر تھی اور ایک مکمل نسخے پر نہ تھی۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب جنگ یمامہ میں حفاظ کرام کی ایک بڑی تعداد شہادت پا گئی۔ حضرت

عمرؓ نے اس طرف خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکرؓ کی توجہ مبذول کرائی کہ حفاظ کے دنیا سے چلے جانے سے بعد والوں کو قرآن کی ترتیب میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس چیز کی حفاظت کے لئے نبوی ترتیب کے مطابق ایک نسخہ تیار کیا گیا، جسے مسجد نبوی میں رکھ دیا گیا۔ علاوہ ازیں بہت سے صحابہ نے بھی اپنے طور پر نسخے مرتب کئے اور اپنے پاس محفوظ کر لئے۔ صحابہ کرام نے اپنے لئے نسخے تو مرتب کر لئے لیکن بعض صحابہ نے بین السطور اپنی یادداشت کے لئے تشریحی نکات لکھ چھوڑے، بعض نے سورہ فاتحہ کی کثرت تلاوت کے باعث اسے لکھنا غیر ضروری سمجھا۔ (۴۹) لہٰذا مزید عرصہ گزرنے کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر یہ نسخے اسی طرح اگلی نسلوں کے پاس چلے گئے تو ایسا نہ ہو کہ اضافی معلومات اور چھوڑی ہوئی کسی سورت کے باعث امت میں اختلاف پیدا ہو جائے اور تشریحی نکات کو اصل قرآن سمجھ لیا جائے۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں قرآن کے تمام نسخے جمع کر کے ضائع کروا دیئے اور جو نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تیار کروایا تھا اس کی نقول کروا کے اطراف سلطنت میں بھجوا دیں۔ اس طرح سے آج تک اسی نسخے کے ہجا کی پیروی کی جاتی ہے جو حضرت زید بن ثابت نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک قابل ذکر کارنامہ حجاج بن یوسف کا ہے کہ اس نے غیر عربوں کی آسانی کے لئے قرآن پر نقطے لگوا دیئے، جس سے مصحف صدیقی کا ہجا مزید محفوظ ہو گیا اور آج قرآن میں کسی قسم کے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا سیرت کی بنیادی معلومات پوری طرح محفوظ و مامون ہیں۔

حدیث چوں کہ سیرت کا دوسرا اہم ماخذ ہے، لہٰذا اس کی صحت کے بارے میں بھی ایک مختصر تجزیہ مضمون کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ علم حدیث ایک متواتر علم ہے اور کتب حدیث کے ہر دور کے مخطوطے آج دست یاب ہیں۔ صرف صحیح بخاری کے کئی ہزار پرانے نسخے لکھے ہوئے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ احادیث بھی زبانی اور تحریری دونوں طرز پر محفوظ کی گئیں، لیکن قرآن کی طرح یہاں بھی فوقیت حفظ کو حاصل رہی۔ بعد کے ادوار میں اصل نسخوں کی دست یابی (۵۰) اور اشاعت نے ان زبانی طور پر مروی روایات کی مزید تصدیق کر دی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فواد سیزگن کی تحقیق جو جرمن ہیں قابل ذکر ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کے مصادر پر ایک کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ بخاری میں موجود روایات، جو زبانی سند سے امام بخاریؒ تک پہنچیں مسلسل تحریری ذخائر کی صورت میں بھی موجود ہیں۔ (۵۱) لہٰذا تحریری اور زبانی ہر دو طرح سے حدیث کا رسول اللہ ﷺ تک پہنچنا ثابت ہے۔ اس سے ان اعتراضات کا بطلان ہو جاتا ہے جو احادیث کو چوتھی صدی ہجری میں زبانی روایات، جسے وہ قصے کہانیوں سے منسوب کرتے ہیں، کی مرتب شدہ شکل تصور کرتے ہیں۔ یہ تو ایک کتاب سے متعلق تھا، علما نے صحابہؓ (۵۲) اور تابعین کے

احادیث کے مرتب کردہ مجموعوں کو نئے سرے سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایسے سات مجموعوں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا اور ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ حدیث کے مستند ہونے کے بارے میں علما کا کام اور دلائل ان گنت ہیں، یہاں صرف اتنی وضاحت پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے کیوں کہ اصل موضوع سیرت ہے۔

تدوین قرآن اور تدوین حدیث کی وضاحت کے بعد تیسری چیز خود تدوین سیرت ہے۔ سیرت کی جو معلومات قرآن اور حدیث کے علاوہ ہیں ان کی تدوین کا آغاز بھی رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ ''صحیفہ صادقہ'' میں بہت سی معلومات سیرت سے متعلق تھیں جو بعد میں احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہوگئیں۔ دور نبوی اور دور صحابہ کی سیرت سے متعلق مدون کی گئیں زیادہ تر معلومات کو کتب احادیث نے اپنے اندر محفوظ کیا۔ (۵۳) حضرت براء بن عازب مشہور انصاری صحابی ہیں۔ ان کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ صرف مغازی اور سیرت کے بارے میں املا کروایا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد ابواسحاق السبیعی ہیں، انہوں نے ان سے روایات لیں اور ان کی روایات کے مجموعے کو مرتب کیا۔ امام بخاری کی صحیح میں مغازی اور سیرت کے بارے میں بہت سی روایات ایسی ہیں جو براء بن عازب اور ابواسحاق کی روایت سے منقول ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس بھی اپنے اوقات میں سے ایک حصہ مغازی پڑھانے کے لئے وقف کیا کرتے تھے، اور لوگوں کے بیان کے مطابق مغازی کے بارے میں ان کے پاس اونٹ کے وزن اٹھانے کے برابر یادداشتیں تھیں۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی معلومات کو دو حوالوں سے جمع کیا جاتا تھا، قانونی حوالے سے، جسے سیر کا نام دیا گیا اور تاریخی حوالے سے جسے مغازی کا نام دیا گیا۔ بعد میں مغازی میں دیگر معلومات کی شمولیت سے اسے سیر کا نام دیا گیا۔ سیرت کے دو پہلو ہونے سے ان کے متخصصین بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔ صحابہ کرام میں بہت سے حضرات مغازی میں خاص دل چسپی لیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے ضمن میں ان کے نام گزر چکے۔ تابعین کی بھی ایک بڑی تعداد اس میں دل چسپی رکھتی تھی لیکن ان میں دو نام بہت نمایاں ہیں۔ ایک حضرت عثمانؓ کے صاحب زادے ابان ہیں۔ مغازی پر ان کا مرتب کردہ مجموعہ ان ہی کے نام سے موسوم ہے جس کی یہ اپنے طلبہ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ دوسرا نام عروہ بن زبیرؓ کا ہے جو حضرت عائشہؓ کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے مغازی پر بہت محنت کی اور کئی دفعہ اپنا مجموعہ مرتب کیا، جس سے ان کے بعد کے ہر سیرت نگار نے استفادہ کیا ہے۔ موجودہ دور میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے مختلف کتب سے عروہ بن زبیرؓ کے حوالوں کو جمع کر کے ''مغازی عروہ

بن زبیر'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ بعض صحابہؓ بھی ان سے سیرت کے بارے میں معلومات لیا کرتے تھے۔ (۵۴) تابعین میں ایک اور نام وہب بن منبہ کا ہے جو ہمام بن منبہ کے بھائی تھے۔ یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ ان کی کتاب کا ایک نسخہ جرمنی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ شرحبیل بن سعد، محمد بن شہاب زہری جو آخری تابعی ہیں اور سلیمان بن طرخان کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کی کتاب ''السیرۃ الصحیحہ'' چھپ چکی ہے، مشہور مستشرق فان کریمر نے اسے ایڈٹ کیا ہے۔ تابعین میں سے ایک نام امام زین العابدین کا بھی ہے لیکن ان کی کتاب کے متعلق سیرت کی کتب میں حوالے بہت کم ملتے ہیں۔

تابعین میں عمر بن قتادہ بھی بہت نمایاں ہیں۔ ان کے والد حضرت قتادہ بن نعمانؓ الانصاری کے بارے میں آتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک تھے۔ لہٰذا عمر بن قتادہ کی معلومات غزوات کے حوالے سے بہت اہم تھیں۔ حضرت عمر بن قتادہ نے ان معلومات کو باقاعدہ مرتب کیا اور ان کے بعد یہ ان کے بیٹے عاصم بن عمر کے پاس آئیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علم کی بہت زیادہ روایت کرنے والے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے باقاعدہ انہیں اس بات پر مقرر کیا تھا کہ سیرت اور مغازی کا باقاعدہ درس دیا کریں۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بھی ایک صحابی زادے ہیں اور عروہؒ کے ہم عصر ہیں۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور فقیہ بھی۔ ان کا شمار بھی سبعہ فقہا میں ہوتا ہے۔ ان کے اور عروہ کے اساتذہ اور تلامذہ میں بہت سے مشترک ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری کا ہے۔ امام زہری اگرچہ پہلے سیرت نگار نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنے پیش رؤوں کی تمام معلومات کو یک جا کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس حوالے سے سیرت پر ضخیم کتاب ان ہی کی تھی۔ گو یہ کتاب بھی براہ راست ہم تک نہیں پہنچی لیکن کتب سیرت اور حدیث میں کثرت سے ان کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے علم میں باکمال تھے اور ایک سے زیادہ علوم پر گرفت رکھتے تھے۔ امام مالکؒ تک نے ان سے کسب فیض کیا۔ سیرت کے حوالے سے ان کے تین شاگرد قابل ذکر ہیں، موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد اور محمد بن اسحاق۔

موسیٰ بن عقبہ نے زہری کی تمام روایات کو قلم بند کیا اور اپنے وقت میں سیرت کے مستند عالم مانے جاتے تھے۔ امام مالک انہیں سیرت کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے۔ ان کے دوسرے دو بھائی ابراہیم اور محمد بھی حدیث اور فقہ کے عالم تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کی انفرادیت اصحاب بدر کی مکمل فہرست بنانے میں ہے کہ سب سے پہلے اس کا خیال ان کو آیا۔ اس کی وجہ اصحاب بدر کی اہمیت تھی جو کفر و شرک کے پہلے معرکہ لڑنے پر انہیں اللہ کی طرف سے عطا ہوئی۔ (۵۵) ان کی کتاب بھی بہ راہ راست ہم تک نہیں پہنچی البتہ دو نامکمل

نسخے پروشیا اور برلن کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ کاتب ابن سعد نے دو حوالوں سے موسیٰ کی معلومات کا ایک بڑا حصہ اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ امام زہری کے شاگردوں میں دوسرا نمایاں نام معمر بن راشد کا ہے۔ ان کی بھی مغازی پر کتاب تھی جس کا ذکر ابن الندیم نے کیا ہے۔ محدثین کے ہاں یہ بڑے معتبر تھے۔ (۵۶) معمر بن راشد کے شاگردوں میں سب سے اہم نام عبدالرزاق کا ہے جن کی ''مصنف'' حدیث کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ انہوں نے بھی مغازی پر ایک کتاب لکھی تھی جو زیادہ تر معمر کی معلومات پر مبنی تھی۔

تیسرا نام محمد بن اسحاق کا ہے انہوں نے اپنے سے پیش تر تمام اصحاب کے کام کو جمع کیا نیز جن لوگوں سے رابطہ ہو سکا ان سے زبانی طور پر بھی واقعات کی تصدیق کی۔ اس لحاظ سے سیرت نگاری میں ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں، پہلا ''کتاب المبتدا'' ہے جس میں حضرت آدم سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے جد امجد عدنان تک کی معلومات کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں زیادہ کچھ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، اس لئے محدثین نے اس پر کلام بھی کیا ہے۔ دوسرا حصہ ''البعث'' ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے شروع کر کے آپ ﷺ کی وفات تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ مغازی پر مشتمل ہے جس میں غزوات کا علیحدہ سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعد میں آنے والے تمام سیرت نگاروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ خود مستشرقین نے بھی ان کے کام کی بہت تعریف کی ہے۔ (۵۷) ابن اسحاق کی کتاب کے تقریباً پندرہ نسخوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (۵۸) ابن اسحاق نے امام زہری کے علاوہ بڑے پائے کے تابعین سے کسب فیض کیا۔ ان میں سعید بن مسیّب، ابان بن عثمان، عاصم بن محمد بن ابی بکر، امام نافع کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابن اسحاق مغازی کے اتنے بڑے عالم تھے کہ خود ان کے استاد امام زہری ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ جو علم مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ابن اسحاق کا ممنون احسان ہو کر رہے گا۔

سیرت اور حدیث کے انداز میں فرق کی بنا پر محدثین نے، باوجود ابن اسحاق کے مقام کو تسلیم کرنے کے، ان پر تنقید کی ہے۔ سیرت میں واقعہ نگاری کے باعث راویان کی معلومات کو الگ الگ بیان کرنا محال تھا، لہٰذا ایسا کیا جاتا کہ ایک واقعے کے آغاز میں اس واقعے کے روایت کرنے والے تمام راویوں کا ذکر کر دیا جاتا۔ جب کہ حدیث میں ایک سطر کی معلومات کے لئے بھی الگ سے سند لکھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ محدثین کا یہ اعتراض تھا کہ راویوں کے مجموعی بیان سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ معلومات کا کون سا ٹکڑا کس راوی کا ہے، لہٰذا واقعے کی استنادی حیثیت کو جانچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ابن اسحاق کے بعد واقدی اور ابن سعد پر بھی یہی اعتراض آتا تھا، حال آں کہ ثقاہت میں یہ لوگ شک وشبہ سے بالاتر تھے۔

مسئلہ صرف معلومات کو پیش کرنے کے انداز کا تھا۔ اعتراض کرنے والوں میں سے امام احمد بن حنبلؒ نے اعتدال کی راہ اختیار کی، انہوں نے کہا کہ مغازی کے ضمن میں تو ابن اسحاق کی معلومات کو قبول کیا جائے گا لیکن حلال وحرام کے مسئلے میں ان کی معلومات کو قبول نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ اس کی تخریج کرنا ممکن نہیں۔ ابن اسحاق پر محدثین کا دوسرا اعتراض اسرائیلی روایات کو قبول کرنا تھا۔

ابن اسحاق کی کتاب ابن ہشام کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے جو سیرت ابن ہشام کے نام سے موسوم ہے۔ ابن ہشام نے ایک تبدیلی تو یہ کی کہ مبتدا کے حصے کو نکال دیا جس میں اسرائیلی روایات کی بھرمار تھی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے لے کر عدنان تک کے حالات کو مختصراً بیان کر دیا۔ دوسرا انہوں نے یہ کیا کہ ابن اسحاق کے نقل کردہ غیر مستند شعری حصے نکال دیئے۔ یہ اس لئے کہ ابن اسحاق شعر میں مہارت نہیں رکھتے تھے لیکن ابن ہشام کا یہ خاص میدان تھا۔ انہوں نے ایسی معلومات کو بھی حذف کر دیا جو غیر ضروری تھیں۔ مثلاً ان شعرا کی ہجو یہ شاعری جو بعد میں اسلام لے آئے۔ ابن ہشام کی کتاب آج ہر جگہ موجود ہے اور اس کا دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

باب چہارم: مناہج سیرت۔ سیرت نگاری کے مناہج اور اسالیب

سیرت کے مناہج کو بیان کرنے سے مراد ان مناہج کی درجہ بندی نہیں بل کہ ان قابل ذکر رجحانات کا جائزہ لینا ہے جن کے تحت نامور سیرت نگاروں نے کام کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ پر سیرت نگاروں نے ہر پہلو سے کام کیا ہے، ان تمام اسالیب کو بیان کرنا ایک مشکل اور طویل امر ہے۔ یہاں کچھ مزید سیرت نگاروں کا تذکرہ کیا جائے گا، جنہوں نے بیان سیرت کے لئے مختلف مناہج اختیار کئے۔ سیرت کے دست یاب ذخیرے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے سیرت نگاری کے جو بڑے بڑے اسالیب ہمارے سامنے آتے ہیں ان کی تفصیل اس مضمون کا حصہ ہے۔

محدثانہ اسلوب: اس اسلوب میں ان شخصیات نے کام کیا جو دراصل حدیث کے متخصص تھے۔ ان کا بنیادی کام یہ تھا کہ سیرت سے متعلق ایسے مواد کو ترتیب دیا جائے جو حدیث کے کڑے اصولوں پر پورا اترتا ہو۔ (۵۹) حدیث سیرت کا دوسرا اہم مصدر ہے اس پر تفصیلی بحث گذشتہ باب میں ہو چکی۔ کتب احادیث میں سیرت سے متعلق باقاعدہ ابواب موجود ہیں جن میں جہاد اور مغازی کے ابواب زیادہ اہم ہیں۔ لہٰذا سیرت کے حوالے سے انہیں براہ راست دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اس میں عام قاری کے لئے یہ مشکل ہو سکتی ہے کہ ایک واقعہ مکمل طور پر کسی ایک حدیث میں بیان نہیں ہوا بل کہ مختلف احادیث میں اس

واقعے کا ذکر ملے گا اور بعض دفعہ یہ بات مختلف ابواب تک پھیل جاتی ہے۔ سیرت کے محدثانہ اسلوب کے تحت ایسی کتابیں ترتیب دی گئیں جن میں معلومات کا منبع صرف کتب احادیث تھیں لیکن انہیں بیانیہ انداز میں تحریر کیا گیا۔ فتح الباری کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی اس کتاب میں سیرت کے مختلف مباحث پر جابہ جا گفت گو کی ہے اور ایسا صرف روایت کی بنیاد پر کیا گیا۔ لہٰذا کتب احادیث کی طرح کتب سیرت بھی بعینہٖ محفوظ ہیں خاص طور پر جو سیرت کے بنیادی مباحث ہیں وہ حدیث ہی کی طرز پر تحقیق شدہ ہیں۔ البتہ ان بنیادی مباحث میں دوسرے مصادر سے جن میں تاریخ اور ادب قابل ذکر ہیں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم ترین اور مستند ترین کتاب شمائل ترمذی ہے، جسے محدث امام ترمذی نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک، آپ ﷺ کے شخصی عادات وخصائل اور آپ کی ذاتی اور شخصی زندگی کے پہلو شامل ہیں۔ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر اہم زبان میں ہو چکا ہے۔

مسلم سپین میں علمی روایات بہت مضبوط رہی ہیں گو اس کا بیش تر علمی ذخیرہ ضائع ہو جانے کے باعث ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ (۶۰) سیرت کے حوالے سے حافظ ابن عبدالبر الاندلسی قابل ذکر ہیں۔ (۶۱) آپ بہت بڑے محدث، مفسر اور سیرت نگار تھے۔ موطا ہی کے ایک دوسرے شارح قاضی ابوالولید الباجی (۶۲) نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اندلس میں علم حدیث میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ قاضی عبدالبر کی سیرت پر کتاب کا نام الدرر فی اختصار مغازی والسیر ہے۔ یہ اپنے موضوع پر جامع اور مستند ترین کتاب ہے۔ عربی زبان میں کتابوں کے نام مقفع و مسجع رکھنے کا رواج تھا۔ بعض نام بڑے لمبے بھی ہوتے تھے۔ کتاب کے نام کا مفہوم ہے سیر اور مغازی کے اختصار سے بیان کئے گئے چند موتی۔ اس میں انہوں نے موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، عروہ بن زبیر، جتنے بھی لوگوں نے مغازی اور سیر پر کام کیا تھا، ان کے کام کو سامنے رکھا اور جائزہ لے کر ایک ایسی جامع کتاب لکھ دی جس کے بارے میں اہل علم کی رائے ہے کہ اب سیر اور مغازی پر اس سے زیادہ مستند کتاب کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اس میں ایک اضافہ انہوں نے یہ کیا کہ جہاں جہاں صحابہ کے نام نامکمل تھے ان کو مکمل کر دیا۔ بعض صحابہ کرام اپنے ناموں کی بہ جائے کنیت سے مشہور تھے، کہیں ان کی کنیت نہیں صرف نام بیان ہوا تھا کہیں والد کا نام بیان ہوا، کہیں کسی نے کہا کہ فلاح صاحب نے کہا کہ میرے دادا نے یہ کہا تھا۔ اب وہ دادا کون تھے ان کا نام کیا تھا اور صحابہ میں ان کا تذکرہ کہاں ملتا ہے، اس کی تحقیق ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو علم حدیث اور رجال پر گہری نظر رکھتا ہو۔ ابن عبدالبر نے ان تمام امور کا اپنی کتاب میں خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی لکھیں جو آگے چل کر بڑی تحقیق کا موضوع بنیں۔ (۶۳)

اندلس کے ہی ایک اور محدث ابن سید الناس ہیں جنہوں نے بہ طور سیرت نگار کے شہرت پائی۔ انہوں نے ایک کتاب **عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر** لکھی جس میں انہوں نے تین چیزوں کو جمع کیا، رسول اللہ ﷺ کے شمائل، سیرت کے اہم واقعات، مغازی اور غزوات۔ یعنی ابن عبدالبر کے مندرجات میں شمائل کا اضافہ کیا گیا جس کی بہ دولت یہ کتاب ابن عبدالبر کی کتاب کی تکمیلی جلد بن گئی۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ ابن اسحاق اور واقدی کے کام کا گہرائی سے جائزہ لیا اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے ان دونوں کے بارے میں کوئی منفی یا مثبت رائے دی تھی۔ دونوں قسم کی آرا کا تفصیلی محاکمہ کرنے کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ دونوں کے بیانات بالکل مستند ہیں اور ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو صحیح احادیث اور سیرت کے عمومی ڈھانچے سے متعارض ہو۔

محدثانہ نقطۂ نظر سے دور متوسط میں لکھی جانے والی آخری کتاب علامہ ابن کثیر (۶۴) کی سیرت النبی ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اصل میں ان کی مفصل کتاب تاریخ البدایہ والنہایہ کا حصہ ہے۔ (۶۵) اسی طرز پر جدید دور میں مصر کے شیخ سعید حوی نے ایک کتاب لکھی جسے سیرت ابن کثیر کا تکملہ کہنا چاہئے۔ اس کتاب کا نام **الاساس فی السنۃ وفقہ** ہے اور چار جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے فقہیات سیرت اور حدیثیات سیرت کو بیان کیا ہے۔ پہلی دو جلدیں خالص واقعات سیرت پر ہیں، تیسری جلد رسول اللہ ﷺ کے شمائل، خصائل، اہل بیت اور اصحاب پر مشتمل ہے اور چوتھی جلد نمایاں صحابہ کرام کے تذکرے پر مشتمل ہے جس میں خلفائے راشدین کا بھی بھرپور تذکرہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ محدثانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی سیرت کی چند اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے روایات کے ساتھ ان کے مدارج بیان کئے ہیں جس کے لئے انہوں نے اپنے جد امجد شیخ محمد جعفر الکتانی کی کتاب **الرسالۃ المستطرفہ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفہ** سے استفادہ کیا ہے جس میں کہ کتب احادیث کے مختلف مدارج بتائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے قدیم ائمہ فن کے ساتھ جدید محدثین سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ ناصر الدین البانی اور شیخ شعیب الارناؤط شامل ہیں۔ حدیث اور معاملات کو بیان کرنے میں سعید حوی کا انداز شبلی جیسا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے نبیؐ کون تھے اور ہمارے لئے کیا لائے تھے۔

مورخانہ اسلوب: جیسے کہ بیان ہوا کہ احادیث میں زیادہ توجہ روایت کے درست ہونے پر دی جاتی ہے اور معلومات کے ہر حصے کے راویوں کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح جس سے کہ کسی واقعے کا ایک مکمل بیان پڑھنے کو نہیں مل سکتا۔ اس مسئلے کو اس طرح سے حل کیا گیا کہ ایک واقعے کی تمام

روایات کو ایک مرتب انداز میں بیان کی شکل دی اور اس کے راویوں کو واقعے کے شروع میں بیان کر دیا گیا۔ یہ انداز تابعی عروہ بن زبیر نے شروع کیا تھا جن سے خلیفہ عبدالملک نے سوالاً عہد نبوی کے مختلف واقعات کے بارے میں دریافت کیا تو عروہ نے راویوں نے نام یک جا کر کے بیان کئے اور اس کے ذیل میں واقعے کو بیان کر دیا۔ اسے مورخانہ اسلوب کہتے ہیں اور اس میں واقدی، ابن اسحاق، ابن سعد اور زہری قابل ذکر ہیں۔ شروع میں اس انداز پر محدثین نے اعتراض کیا۔ (۶۶) کیوں کہ اس انداز میں یہ واضح نہیں ہوتا تھا کہ واقعے کا کون سا حصہ کس راوی کا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ اعتراض ختم ہو گیا کیوں کہ جس کسی نے پورا واقعہ پڑھنا ہوتا تھا اسے اس سے غرض نہیں ہوتی تھی کہ اس کے راوی کون ہیں، لہٰذا قاری کی دل چسپی نے مورخانہ اسلوب کو پذیرائی بخشی اور یہ اسلوب عام ہو گیا۔ (۶۷)

مورخانہ اسلوب کے رواج پا جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس پر جو اعتراض تھا وہ صرف اس کے انداز تک محدود تھا جب کہ حقیقت میں اس اسلوب کی روایات بھی محفوظ تھیں۔ اس کی مثال عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ کا تقابل ہے۔ دونوں میں سے موخر الذکر کو محدثین کے ہاں اعتبار حاصل تھا، لیکن جب دونوں کے روایت کردہ واقعات کو جمع کر کے مرتب کیا گیا تو دونوں مجموعے ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی عروہ بن زبیر نے جن واقعات کو بیان کیا وہ مستند راویوں سے ہی لئے گئے تھے۔

اس اسلوب کی مزید توثیق امام شافعی جیسے عظیم محدث اور فقیہ نے کی۔ امام بیہقی (۶۸) ان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مجھ سے ایک سے زیادہ اہل علم نے جو سچائی کے وصف سے متصف تھے، جن کا تعلق مکے اور مدینے کے قریشی اور غیر قریشی قبائل سے تھا اور ان میں سے کچھ حضرات علم حدیث سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واقف تھے اور ان میں سے بعض نے اس حدیث کے حصے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بیان کئے ہیں۔ اس تمہید کے بعد امام شافعی اصل بات بیان کرتے ہیں۔ (۶۹) جس اسلوب پر شروع میں محدثین اعتراض کرتے تھے وہ خود محدثین نے ہی اپنا لیا تھا۔

مورخانہ اسلوب کے حوالے سے معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ علامہ ابن جریر طبری کا ہے جو تفسیر میں بھی برابر کا مقام رکھتے تھے۔ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ کے مغازی کا بیش تر حصہ ان ہی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ ان کی کتاب آدم علیہ السلام سے لے کر ان کے دور کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ابن جریر نے واقعات کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن ان کا درجہ متعین نہیں کیا۔ اپنے مقدمے میں انہوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ روایات کی جانچ پڑتال کا کام وہ استفادہ کرنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔ اس سے بعض اذہان اس طرف گئے ہیں کہ شاید ان کا تیار کردہ ذخیرہ معلومات بالکل قابل اعتماد نہیں لیکن کچھ

روایات کے قابل اعتماد نہ ہونے سے یہ حکم سارے ذخیرے پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ امام ذہبی نے سیرت پر ایک کتاب مورخانہ اسلوب کے مطابق لکھی ہے۔ امام ذہبی محدث بھی تھے اور رجال کے ماہر بھی لہٰذا ان کی کتاب استناد کے لحاظ سے سب سے عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ مسعودی اور یعقوبی نے بھی اس طرز پر کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کا درجہ متذکرہ بالا کتابوں سے کم ہے۔

مورخانہ اسلوب سے طبقات نویسی (۷۰) کی طرح پڑی جس میں تاریخ کے ساتھ رجال کو اکٹھا کر دیا گیا۔ یہ طبقات صحابہ سے لے کر تابعین اور تبع تابعین یعنی خیر القرون کے احوال کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ صرف صحابہ کے لئے گیارہ طبقات قائم کئے گئے ہیں۔ اس اسلوب میں سب سے اولین کام کاتب محمد ابن سعد کی ''طبقات الکبریٰ'' ہے جو معلومات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ انہوں نے بھی سند کا اہتمام کیا ہے لیکن طبری کی طرح صحت کا اہتمام بعد والوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ طبقات صحابہ پر تین کتابیں بہت مشہور ہیں: ابن عبدالبر کی **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**، ابن حجر کی **الاصابہ فی تمییز الصحابۃ** اور ابن اثیر کی **اسدالغابہ**۔ یہ طبقات ترتیب زمانی کے لحاظ سے ہیں۔ اس کے علاوہ مکانی حوالے سے بھی طبقات کو ترتیب دیا گیا، جیسے خطیب البغدادی کی ''تاریخ بغداد'' یہ بھی محدث تھے اور انہوں نے بغداد میں آنے والے اہل علم کو طبقات میں ترتیب دیا ہے۔ یہی کام علامہ ابن عساکر نے دمشق کے بارے میں ''تاریخ دمشق'' لکھ کر کیا جس میں فتح دمشق سے لے کر مصنف کے وقت تک کے حالات پائے جاتے ہیں۔

مولفانہ اسلوب: ایک موضوع پر قابل قدر مواد اکٹھا ہو جانے کی صورت میں اس کی تالیف ایک ناگریز عمل ٹھہرتا ہے۔ یہی مرحلہ سیرت نگاری میں بھی آیا کہ جب روایات کو اکٹھا کرنے کا کام مکمل ہو گیا تو ان روایات کو سامنے رکھ کر کتابیں تالیف کی جانے لگیں۔ یہ کام تیسری صدی ہجری کے اواخر سے لے کر آج کے دور تک جاری وساری ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوا کہ جس کسی نے سیرت کو تالیف کیا اس نے صرف معلومات کو یک جا نہیں کیا بل کہ ان کا پھر سے جائزہ لیا، جس سے تحقیق در تحقیق کا فریضہ سرانجام پایا۔ ہر نئی تالیف سے بعض نئے پہلو سامنے آئے۔ علاوہ ازیں تالیف سے مختلف کاموں کا تقابلی جائزہ بھی ہوتا رہا جس سے کہ مضبوط روایات اور آرا واضح ہو کر سامنے آئیں۔ جہاں خلا تھا وہ پر ہو گیا۔

لیکن اس کے ساتھ اس اسلوب کا ایک منفی پہلو بھی تھا کہ کتابوں کو زیادہ ضخیم کرنے کے سلسلے میں کم زور روایات نے بھی برابر اپنی جگہ بنائے رکھی۔ وہ زمانہ چوں کہ اسلام کے عروج کا تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے حوالے سے اس طرح سے نکیر کرنا جس طرح کے جدید دور میں مستشرقین نے کی ممکن نہ تھا، لہٰذا یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک کے جاری رہا۔ (۷۱)

فقہیانہ اسلوب: اس سے پیش تر بیان ہو چکا ہے کہ سیرت کا آغاز حیات طیبہ کے قانونی نکات کو قلم بند کرنے سے ہوا جسے سیر سے موسوم کیا جاتا تھا لہٰذا اس پہلو کا سیرت کے ساتھ رہنا ایک فطری امر تھا۔ سیرت کے مطالعے کا ایک انداز یہ بھی راوج پایا کہ معلومات سیرت میں کون کون سے فقہی احکامات اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے حج کرنے سے بہت سے احکامات نکلتے ہیں جیسے فقہا نے اپنی حج کی فقہ مرتب کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے حج قران فرمایا، امام احمد بن حنبل کے نزدیک حج افراد اور امام شافعی کے نزدیک یہ حج تمتع تھا لہٰذا جس نے اس کو جس انداز سے لیا اس انداز سے افضل قرار دیا۔ ان فقہی آراء کا قائم ہونا ان معلومات پر منحصر ہے جو کہ حدیث اور سیرت کی وساطت سے سامنے آئیں۔ لہٰذا یہ سیرت نگاری کا فقہی اسلوب ہے۔

متکلمانہ اسلوب: سیرت کا مطالعہ علم کلام کے ضمن میں کرنا، اس کا متکلمانہ اسلوب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے مضامین کی عقلی دلائل سے توجیہہ کی جائے اور اس سلسلے میں نبوت اور معجزات کی بحث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی اسلوب سے وہ ذیلی علم ترتیب پاتا ہے جسے ہم دلائل نبوت کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں۔

ادیبانہ اسلوب: سیرت کا یہ اسلوب بہت بعد کی اختراع ہے اور عربی سے پہلے اس نے فارسی اور اردو میں رواج پایا۔ اس اسلوب میں سیرت کو حکایت کے طرز پر یا منظوم شکل میں ڈھالنے کا کام شروع ہوا تا کہ مضمون میں ادبی چاشنی پیدا کر کے اسے عام لوگوں میں مقبول بنایا جاسکے۔ اس اسلوب کی مدد سے سیرت کی ذیلی شاخ لوک سیرت (اگر ایسا کہنا مناسب ہو تو) وجود میں آئی جس کی تفصیل اس سے قبل آچکی۔ (۷۲)

مناظرانہ اسلوب: یہ اسلوب اس وقت منظر عام پر آیا جب اسلام کے مختلف مسالک نے ایک دوسرے پر اپنی علمی اور فقہی برتری ثابت کرنی شروع کی اور اس سلسلے میں اپنے موقف کے لئے سیرت سے دلائل پیش کئے۔ اس کا آغاز تو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ہی ہو گیا تھا لیکن اس کا زیادہ زور برطانوی ہند میں ہوا جب مختلف مسالک ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے۔ مسلکی حوالے سے تو یہ ایک منفی طرز عمل تھا لیکن سیرت کے حوالے یہ فائدہ مند ثابت ہوا کہ اس سے لوگوں میں سیرت کے واقعات اور معاملات عام ہونے لگے۔

باب پنجم: چند نام ور سیرت نگار اور ان کے امتیازی خصائص

اسلام کا روایتی عہد معیاری نظام تعلیم اور اعلیٰ تحقیقی کاوشوں سے مرکب ہے۔ اس عہد میں ہر قلم

اٹھانے والا اپنے مضمون میں ایک نئی جہت کو متعارف کراتا تھا اور ہر کتاب یا تو گذشتہ کتابوں کا تکملہ ہوتی تھی یا پھر نئے کام کا مقدمہ۔ سیرت نگاری بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر سیرت نگار نام وری کے رتبے پر فائز ہے لیکن ان تمام کا تذکرہ تحریر کو بہت طویل کردے گا۔ برصغیر اور جدید دور کے سیرت نگاروں کا تذکرہ الگ مضامین میں آئے گا اور یہاں ابتدائی چند سیرت نگاروں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ محققین کی رائے کے مطابق سیرت کی تقریباً تمام ابتدائی کتابوں کی بنیاد چار بڑی شخصیتوں کی تحقیق پر قائم ہے۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے دوسری صدی ہجری میں سیرت نگاری کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ (۷۳) ان میں محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ)، محمد بن عمر واقدی (م ۲۰۸ھ)، محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ) اور عبدالملک بن ہشام (۲۱۸ھ) کے نام شامل ہیں۔ ابن اسحاق کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے لہٰذا یہ بحث واقدی سے شروع کی جائے گی۔

محمد بن عمر الواقدی: واقدی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مغازی کے واقعات کو اس تفصیل سے جمع کیا کہ دور نبوی کے واقعات ایک فلم کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا اسلوب مورخانہ تھا جو محدثین کی نظر میں مستند نہیں تھا۔ اس کے بارے میں پچھلے باب میں بحث ہو چکی۔ (۷۴) لیکن محدثین کے اعتراض کا یہ مطلب نہیں کہ محدثین ان کے ذخیرے کو کلیتاً ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام مالک نے ان کے انداز پر تحفظات کا اعتراض کیا ہے لیکن انہیں جب سیرت سے متعلق کوئی رہ نمائی درکار ہوتی تو وہ واقدی سے ہی رجوع کرتے۔ ایک دفعہ امام مالک کے حلقہ درس میں یہ سوال اٹھا کہ جادو کرنے والے کی کیا سزا ہے تو امام مالک نے واقدی کو لکھ کر دریافت کیا کہ جس عورت نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا تھا اس کو کیا سزا دی گئی تھی تو واقدی نے جواب میں لکھا کہ اسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ امام مالک نے اس مسئلے کا یہی حکم بیان کیا۔ محدثین کے مورخانہ اسلوب پر اعتراض کے حوالے سے ابن سید الناس نے ایک درمیانی نقطہ پیش کیا ہے کہ جب ایک آدمی بہت زیادہ لکھتا ہے تو وہ عام ڈگر سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں کہہ جاتا ہے جس پر اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں۔ بعض کا اعتراض نرم ہوتا ہے اور کچھ کا شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اس اعتراض سے قطع نظر کہ واقدی نے کیا اسلوب اپنایا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ کام محبت اور عقیدت کے جذبات کے تحت کیا۔

خطیب بغدادی جو خود بہت بڑے محدث تھے لکھتے ہیں کہ واقدی نے مشرق و مغرب کے لوگوں سے کسب فیض حاصل کیا۔ کسی شخص کے لئے جو سیرت اور ابتدائی تاریخ اسلام سے شغف رکھتا ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ واقدی کی تحقیقات سے صرف نظر کر سکے۔

واقدی ایک فقیہ بھی تھے اس لئے وہ مغازی کے ساتھ سیر میں بھی مہارت رکھتے تھے، جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا قانونی نقطہ نظر سے مطالعہ تھا۔ وہ قاضی بھی تھے اور انہوں نے فقہ پر بھی ایک کتاب لکھی۔ ایک کتاب انہوں نے اختلاف حدیث پر بھی لکھی، جس میں ان احادیث کے درمیان تطبیق سے بحث کی گئی ہے، جو بہ ظاہر ایک دوسرے کے خلاف جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر بھی واقدی نے کام کیا جو اصل میں تو دست یاب نہیں لیکن اسے امام شافعی جیسے محتاط محدث نے اپنی کتاب الام میں محفوظ کرلیا۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب الام کی چوتھی جلد میں امام شافعی نے سیر الواقدی کے نام ایک کتاب موسوم کی ہے جو واقدی کی سیر کا حصہ ہے۔ یہ مکمل کتاب واقدی کی نہیں اور نہ واقدی کی کتاب کا بقیہ حصہ ہم تک پہنچا ہے۔ تاہم اس سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ واقدی کو علم سیر اور مغازی دونوں سے دل چسپی تھی۔ محمد بن سلام الجمحی ایک مشہور مورخ اور ادیب ہیں جنہوں نے طبقات پر ایک کتاب لکھی ہے طبقات الشعرا۔ یہ واقدی کے جونیئر ہم عصر ہیں۔ انہوں نے واقدی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان کے پاس اس قدر کتابیں تھیں کہ ۱۲۰ اونٹوں پر اٹھائی جاتی تھیں اور ان کے مسودات ۶۰۰ صندوقوں میں محفوظ تھے۔ ابن الندیم نے واقدی کی لکھی ہوئی ۲۸ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اساتذہ میں امام مالک، معمر بن راشد، سفیان ثوری اور سندھ کے ایک بزرگ ابو معشر نجیح السندی بھی شامل تھے۔

علامہ واقدی روایات کی تحقیق میں ایسے طریقے بروئے کار لاتے جنہیں بلاشبہ جدید تحقیق کے رجحانات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ وہ روایات کے زمان ومکان کا تعین کرنے میں بہت سرگرم رہتے تھے۔ مغازی یا تاریخ کی حدیث سے انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اس بات کا التزام کیا جاتا ہے کہ واقعات کی ترتیب کیا تھی۔ علامہ واقدی اس چیز کے ساتھ ان مقامات کا بھی سروے کرتے جن سے کوئی واقعہ متعلق ہوتا، خاص طور پر غزوات کے سلسلے میں۔ وہ ہر جگہ خود جاتے اور اس کا نقشہ مرتب کرتے اور وہاں جو بھی جغرافیائی چیزیں ہوتیں ان سب کو احاطہ تحریر میں لے کر آتے۔ اس سلسلے میں وہ بڑی جانفشانی سے کام لیتے۔ مثال کے طور پر ایک روایت کے مطابق سخت گرمی کے موسم میں اپنے ساز وسامان کے ساتھ واقدی تیز تیز کہیں جارہے تھے۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ آج ہی صحابہ کی اولاد میں سے کچھ نے غزوہ حنین کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں، لہٰذا حنین کا مقام دیکھنے جارہا ہوں۔ حنین مکے سے ستر اسی کلومیٹر کی مسافت پر ہے، لہٰذا یہ کٹھن سفر وہ معلومات کی مزید تصدیق کے لئے کررہے تھے۔ اسی طرح ایک دن خلیفہ ہارون الرشید کو مدینے میں انہوں نے مختلف یادگاروں کی زیارت کرائی اور ان کا تعارف کرایا۔ یہ دورہ ساری رات جاری رہا۔ اس چیز نے خلیفہ کے دل پر اتنا اثر کیا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد دیر تک روتا رہا۔

واقدی نہ صرف سیرت پر معلومات کو مرتب کرتے تھے بل کہ انہیں حفظ بھی کرتے تھے۔ ابن سید الناس کی ایک روایت کے مطابق واقدی مسجد نبوی میں بیٹھ کر اپنی مرتب کردہ چیزوں کو یاد کیا کرتے تھے۔

واقدی کی کتاب کتاب المغازی تین جلدوں پر مشتمل ہے اور بعض آرا کے مطابق یہ مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچی لیکن یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جاسکتی۔ کتاب کا آغاز ہجرت کے واقعات سے ہوتا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید یہ مکمل نسخہ نہیں، کیوں کہ ہجرت سے پہلے کے واقعات بیان نہیں کئے گئے۔ جب کہ اس کا اختتام غزوہ تبوک کے تذکرے کے بعد جیش اسامہ کی تفصیل پر ہوتا ہے جس کی روانگی کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا اور اس پر عمل درآمد حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ کی حیثیت سے کروایا۔ غزوات کے بارے میں جتنی معلومات وہ دے سکتے تھے انہوں نے دیں۔ انہوں نے شروع کے آٹھ دس صفحات پر پہلے تمام غزوات کا خلاصہ دیا ہے۔ اس میں ۲۷ غزوات اور ۴۷ سرایا کا ذکر ہے۔ تین دفعہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ فرمایا۔ غزوہ بدر کا بیان واقدی کی کتاب کے ۱۵۳ صفحات پر پھیلا ہوا۔ اس قدر تفصیل سے بدر کا ذکر کسی اور نے بیان نہیں کیا۔ بقیہ تمام کتب میں غزوہ بدر کا ذکر دس صفحات سے زیادہ نہیں ہوتا۔ واقدی نے چوں کہ پوری زندگی اس کام میں لگائی تھی جو معلومات ممکن ہوسکتی تھیں وہ جمع کیں۔ کفار مکہ کی طرف سے کون کون لڑنے آیا، کون کون مرا اور یہ بھی کہ کسی نام میں اختلاف ہے کہ نہیں۔ صحابہ میں سے کون کون شہید ہوئے، نیز ان کے قبیلوں کے نام، اسلحہ کیا تھا، کس کے پاس نہیں تھا، گھوڑے اونٹ کتنے تھے اور کس کس کے تھے، یہ تفصیل منطقی ترتیب سے درج کی گئی ہے۔ اس بات کی بھی تفصیل ملتی ہے کہ سراغ رسانی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جو شعبہ قائم کیا تھا وہ کیسے کام کرتا تھا۔ غزوات کے حوالے جو مزید تفصیل ہے وہ سیر کی ہے کہ ان غزوات کی تفصیل سے کون سے قانونی پہلو نکلتے ہیں۔ ہر غزوے کے بعد قرآن پاک میں اس پر جو تبصرہ آیا ہے وہ بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی غیر موجودگی میں کس کس کو مدینے میں جانشین بنایا۔ جنگ میں مسلمانوں کا شعار password کیا تھا، اس نوعیت کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ استناد کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ واقدی کے بیان میں بنیادی باتیں وہی ہیں جو بقیہ سیرت نگاروں نے بیان کی ہیں، البتہ ان خاکوں میں رنگ بھرنے کے لئے واقدی نے تفصیلات فراہم کی ہیں۔ واقدی سے قبل غزوات کی تاریخ بیان کرنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ واقدی نے اہتمام کے ساتھ غزوات کی تاریخوں کو بیان کیا ہے۔ یہ چیز بہت اہمیت کی حامل تھی کیوں کہ اس طرح سے مختلف احکامات جو تدریجاً نازل ہوئے ان کی تفصیل کا پتا چلتا ہے۔

غزوات کے علاوہ بھی بے شمار تفصیلات واقدی کی کتاب میں موجود ہیں۔ ان میں سے مدینے کے

اسلامی معاشرے کے حوالے سے بیان کی گئیں معلومات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر مدینہ منورہ میں زراعت کا نظام کیا تھا۔ کون کس زمین کا مالک تھا۔ کس کی زمین میں کیا کاشت ہوتا تھا۔ یہودیوں کے پاس کون کون سی زمینیں تھیں۔ کن کن قبائل کے ساتھ کون کون سے قبائل کی تجارت تھی۔ مدینے میں کھانے پینے کے رواج کیا تھے؟ مختلف سطح کے لوگ کس قسم کا کھانا کھاتے تھے۔ وہاں موجود مشرکین کن بتوں اور دیویوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تجارتی کاروان کیسے جایا کرتے تھے، ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوتا تھا اور اس کے علاوہ قافلے کو کامیابی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے کیا کیا انتظامات کئے جاتے تھے۔

واقدی کی کتاب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۸۵۵ میں شائع کی تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی اشاعت میں بہت دل چسپی لی تھی۔ جرمن مستشرق ول ہاوزن نے اس کا جرمن میں ترجمہ بھی کیا جو ۱۸۸۲ میں چھپا تھا۔ یہ ترجمہ کس معیار کا تھا شاید ایک نکتے سے اس کی وضاحت ہو سکے۔ اس ترجمے کی بنیاد پر ایک مشہور مستشرق مارگولیتھ نے یہ بات لکھ ڈالی کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ بہادر نہیں تھے۔ اس ضمن میں اس نے لکھا ہے کہ جب بدر کے دن آپ نے خون دیکھا تو آپ بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش آیا تو جنگ جاری تھی۔ یہ رائے اس عبارت کے غلط ترجمے کی وجہ سے قائم ہوئی یا قائم کی گئی جس میں اللہ کی طرف سے مومنوں پر نیند طاری کر دینے کا ذکر ہے اور جب نیند چھٹی تو جنگ جاری تھی۔ لفظ یغیش کو بے ہوشی کی معنوں میں لیا گیا اور واقدی کے یہ الفاظ کہ جب رسول اللہ ﷺ کو قریش کے حملے کی خبر ہوئی تو آپ گھبرا کر اٹھے کو ڈرا اور خوف پر محمول کر لیا گیا، جس سے یہ غلط منظر پیدا کیا گیا کہ آپ ﷺ بہادر نہیں تھے۔

محمد بن سعد: ابن سعد واقدی کے شاگرد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے استادوں میں مشہور فقیہ اور محدث سفیان بن عیینہ، امام بخاری کے استاد وکیع بن الجراح، مشہور محدث فضل بن دکین اور سفیان بن حرب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحٰق، ہشام بن محمد بن سائب اور ابو معشر نجیح السندی کے کام سے استفادہ کیا۔ محدثین کی ایک بڑی تعداد نے ابن سعد کو ثقہ اور حافظ قرار دیا ہے ان میں متاخر دور کے دو بڑے نام شامل ہیں، خطیب البغدادی اور ابن حجر عسقلانی۔ ابن سعد سیرت نگار اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ مامون نے کسی اہم معاملے میں مشورے کے لئے سات بڑے فقہا کو بلایا ان میں ابن سعد بھی شامل تھے۔ قرأت اور علم انساب میں بھی درک رکھتے تھے۔ آپ کی کتاب کا بڑا حصہ ان کے استاد واقدی کا جمع کردہ ہے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے یہ فرامین اپنے استاد واقدی سے لئے ہیں۔

بقیہ کتابوں کی طرح ابن سعد نے بھی تخلیق آدم سے آغاز کیا اور اس سلسلے میں اسرائیلیات کو قبول

کیا۔(۷۵) طبقات الکبریٰ کی پہلی دو جلدیں سیرت پر مشتمل ہیں۔ بقیہ دو جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ صحابہ کے حالات بیان کرنے میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی اس ترتیب کو ملحوظ رکھا کہ جب انہوں نے دیوان مرتب کیا تھا تو پہلے ان صحابہ کا نام شامل کیا جو رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے تھے پھر ان کے قریبی رشتے دار اور پھر بقیہ اصحاب۔ یہ ترتیب اسلام قبول کرنے کے حوالے سے تھی۔ اس کے علاوہ ترتیب مکانی کے حوالے سے معلومات مدون کیں اور ان کو مختلف شہروں کے حوالے سے بیان کیا۔ ابن سعد پہلے آدمی ہیں جنہوں نے دلائل نبوت پر مواد اکٹھا کیا۔ اسی طرح وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے شمائل نبوی پر سب سے پہلے اتنا بڑا مجموعہ فراہم کیا۔ بعد میں جن لوگوں نے صحابہ کے تذکرہ یا اسلامی تاریخ پر کتابیں لکھیں، ان سب نے ابن سعد سے استفادہ کیا ہے۔ ابن سعد سے استفادہ کرنے والوں میں بلاذری، ابن اثیر، ابن حجر، ابن کثیر، ذہبی اور ابن عساکر شامل ہیں۔

عبدالملک ابن ہشام: یمن کے رہنے والے تھے اپنے استاد زیاد بن عبداللہ البکائی کے واسطے سے ابن اسحاق کی کتاب کو محفوظ اور مرتب کیا اور آج ابن اسحاق کی کتاب کو ان ہی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ ابن ہشام نے اتنا غیر معمولی کام کیا کہ آج سیرت پر مستند ترین، جامع ترین اور قدیم ترین کتاب ان ہی کی ہے۔ یہ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث بھی تھے، فقیہ بھی، مورخ بھی اور ادیب وشاعر بھی۔ ابوعبیدہ معمر بن المثنی جو قرآنی ادبیات اور لسانیات کے ماہر تھے ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔(۷۶) ایک اور سیرت نگار محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یمن بھیجے گئے گورنر کے پوتے تھے، بھی ان کے استاد ہیں۔ ابن ہشام کے والد اور دادا بھی صاحب علم تھے۔

ابن ہشام نے سیرت ابن اسحاق کا تنقیدی مطالعہ کر کے اس کی تہذیب کی۔ انہوں نے پہلا حصہ المبتدا تقریباً سارا ہی نکال دیا کیوں کہ ان کے مطابق اس کی تفصیلات سیرت سے متعلق نہیں تھیں۔ یہ حصہ زمانہ قبل از اسلام سے متعلق تھا اور اسرائیلیات پر مبنی تھا۔ انہوں نے اس حصہ کا اختصار کے ساتھ ایک خلاصہ دے دیا، جس سے اجمالاً یہ اندازہ ہو جائے کہ بقیہ انبیا کون کون تھے اور یوں پوری جلد کو آٹھ دس صفحات میں ملخص کر دیا۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ سیرت ابن اسحاق کے ادبی حصے پر تنقیدی نظر ڈالی۔ ابن اسحاق نے جو معلومات جمع کی تھیں ان میں بہت سے اشعار اور قصائد بھی بیان کئے تھے جو مختلف جنگوں کے موقع پر شعرا نے کہے تھے۔ ابن اسحاق خود ادیب یا شاعر نہیں تھے اس لئے ان کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ کون سے اشعار حقیقی ہیں اور کون سے منسوب یا الحاقی۔ ابن ہشام جیسا کہ بیان ہوا خود شاعر اور ادیب تھے انہوں نے غیر مستند اور غیر ضروری اشعار کو نکال دیا۔ علاوہ ازیں ایسے اشعار جن سے بعد میں کوئی

بدمزگی پیدا ہونے کا امکان تھا وہ بھی نکال دیئے گئے۔(۷۷) بعض اشعار ثقاہت سے گرے ہوئے اور غیر معیاری تھے وہ حذف کر دیئے گئے۔اس کے علاوہ انہوں نے مشکل الفاظ، اشعار سے متعلق رائے، اشعار کی غلط نسبت کی تصحیح، غلط العام باتوں کی تصحیح سے متعلق اپنے حواشی دیئے جو متن کے اندر ہی ہیں لیکن قال ابن ہشام سے ان کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔

سیرت ابن ہشام کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، بعض نے اس کے خلاصے لکھے، بعض نے اس کو نظم بھی کیا اور اس کے ترجمے دنیا کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں۔آج سیرت جو کچھ ہے اس کا بہت بڑا حصہ ابن ہشام کی اس کتاب کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ابن ہشام کی ایک شرح الروض الانف کے نام سے مشہور ہے جسے علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن السہیلی (م ۵۸۱ھ) نے لکھا ہے۔یہ اسپین کے رہنے والے تھے اور ایک ساحلی شہر مالقہ میں مقیم تھے۔انہوں نے ایک کام تو یہ کیا کہ جو قصائد تھے ان کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی۔جہاں کمی محسوس ہوئی اس کمی کو تشریح، دلیل اور اضافے سے دور کیا۔اگر کسی واقعے سے کوئی اہم نکتہ نکلتا ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا۔یہ وہ چیز ہے جسے ہم فقہ السیرہ کے نام سے جانتے ہیں۔سہیلی خود بڑے ادیب اور نحوی تھے اس لئے انہوں نے نحوی قواعد وضوابط پر بھی بات کی۔جس قصیدے کے کسی شعر سے کوئی نحوی اصول نکلتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔علامہ سہیلی محدث، فقیہ، لغوی، نحوی، ماہر انساب، مفسر اور مورخ تھے اور ان کی یہ تمام حیثیتیں ان کی شرح سے مترشح ہیں۔

سیرت کے حوالے سے اندلس کے ہی ایک اور عالم قابل ذکر ہیں۔یہ ابومحمد علی بن حزم ہیں۔انہوں نے سیرت سے متعلق دو کام کئے ہیں۔ایک تو انساب پر کتاب لکھی جو آج مطبوعہ موجود ہے۔اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے نسب سے متعلق تحقیق کی اور اس سلسلے میں بہت سا غیر مستند مواد مسترد کر کے ایک جامع کتاب مرتب کی۔دوسری کتاب انہوں نے جوامع السیرہ کے نام سے لکھی جس میں انہوں نے سیرت پر موجود تمام کتب کی تلخیص کی۔

اندلس کے ایک اور عالم ابوالربیع سلیمان الاندلسی (م ۶۳۴ھ) نے ایک کتاب **الاکتفا فی مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء** کے عنوان کے تحت لکھی جس کی بنیادی خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جن میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق کی کتابوں کے طویل اقتباسات ملتے ہیں۔کتاب کا آغاز معد بن عدنان کے زمانے سے ہوتا ہے اور موضوع کے مطابق حضرت عثمان کی خلافت تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ایک چیز اس کو سیرت کی بقیہ کتابوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے اس میں اسی نوعیت کی معلومات بھی ملتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں کون کون سے مذہبی عقائد مروج

تھے، عربوں میں مذہبی ثقافت کیا تھی نیز یہ کہ کن کن بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس کے بعد جس کتاب کا تذکرہ کرنا مقصود ہے وہ سیرت کے بیش تر موضوعات کا مرقع ہے۔ یہ علامہ ابن قیم کی **زاد المعاد فی ھدي خیر العباد** ہے۔ ادبیات سیرت، فقہیات سیرت، نفسیات سیرت اور روحانیات سیرت سب کا برابر مہارت کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ایک سہ آتشہ ہے جو ابن قیم نے تیار کر دیا ہے۔ اس میں سیرت کی پاکیزگی بھی ہے۔ اس میں حدیث کے فن اور استناد کو پورے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔ ایک ایک بیان محدثین کی مکمل احتیاط کا نمونہ ہے۔ (۷۸) فقہ النفس، فقہ المعاملات، فقہ السیرۃ، ان میں سے ہر چیز کے بارے میں ایسے توازن سے بیان کیا ہے کہ جس میں محدثین کی سی باریک بینی، فقہا کی جزرسی اور اعتنا بالتفاصیل اور اصحاب سیر کا سا جذبہ حب رسول، سب باتیں بہ یک وقت موجود ہیں۔ انداز یہ ہے کہ پہلے سیرت کا واقعہ بیان کرتے ہیں پھر اس واقعے سے متعلق احادیث بیان کرتے ہیں پھر ان احادیث سے نکلنے والے فقہی مسائل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں کہتے ہیں اس باب کی اصل فہم اور درک کے بیان میں کہ اس میں کیا حکمتیں نکلتی ہیں۔ (۷۹)

زاد المعاد کی تیسری جلد مغازی سے متعلق ہے۔ اس میں انہوں نے جہاد کی فرضیت اور اس کی غرض وغایت سے بحث کی ہے اور ہر غزوے سے نکلنے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔ اس طرح سے سیر کے موضوع کو پھر سے زندہ کر دیا۔ سیر کے مطابق انہوں نے پرائیویٹ انٹرنیشنل لا (۸۰) پر الگ سے احکام اہل الذمہ کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔

ایک کتاب قاضی عیاض کی ہے اور یہ بھی اندلس سے تھے۔ کتاب کا نام **الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ** ہے۔ نام کی مناسبت سے اس میں رسول اللہ ﷺ کے امت پر حقوق اور اس حوالے سے اس امت کی ذمے داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے امتیازی خصائص اور ان کے معجزات کو بیان کیا گیا ہے۔

ایک کتاب شیخ علی بن برہان الدین حلبی کی **انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون** (۸۱) ہے۔ جو سیرت حلبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب استیعاب کے زمانے کی ہے، جس وقت سیرت سے متعلق معلومات کو جمع کیا جا رہا تھا۔ اس لئے اس میں بہت سی کم زور باتیں بھی جمع ہو گئی ہیں خاص طور پر معجزات سے متعلق کم زور اقوال بھی نقل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح قسطلانی کی المواہب اللدنیہ کی علامہ زرقانی نے شرح لکھی ہے۔ یہ سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب

کے آخر میں سراپا اور بعوث کے عنوان سے ایک الگ باب ہے۔ کتاب کے آخری پچیس ابواب میں سیرت کے بعض ضمنی پہلوؤں کے بارے میں اہم معلومات کو یک جا کر دیا گیا ہے مثلاً بارگاہ رسالت میں آنے والے وفود اور سفرا، بارگاہ رسالت سے جانے والے نامہ ہائے مبارک، خصائص نبوی، معجزات، اولاد اور دیگر رشتہ دار وغیرہ۔ جس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کا خیال ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اتنی جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی۔

ایک اور کتاب سبل الھدی و الرشاد فی سیرۃ خیر العباد ہے جسے محمد بن یوسف دمشقی (م ۹۴۲ھ) نے تحریر کیا ہے۔ یہ سیرت شامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور کئی کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ (۸۲) ایک کتاب علامہ تقی الدین مقریزی (م ۸۴۵ھ) کی 'امتاع الاسماع' ہے جو پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے (۸۳)

باب ششم: ریاست مدینہ۔ دستور اور نظام حکومت

حکومت اور ریاست کسی نظام یا ضابطہ حیات کو منضبط کرنے کا ایک مضبوط ذریعہ تو ہے لیکن مقصد نہیں۔ لہٰذا جب اسے ذریعے کی بہ جائے مقصد تصور کر لیا جاتا ہے تو پھر اس میں خود اپنے ضابطوں سے ہی انحراف شروع ہو جاتا ہے اور سیاست و حکومت مفاد پرستی کا مصداق ٹھہرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک ریاست قائم کی، جس کی بنیاد پر خلافت راشدہ میں دنیا کا ایک وسیع رقبہ اسلامی ریاست کی قلم رو میں شامل ہوا۔ مسلمانوں کے تصور دین و مذہب میں یہ چیز اتنی جاگزیں ہے کہ آج جب کہ جمہوری حکومتوں کا دور ہے پرانا نظام حکومت خود مسلمانوں میں ہی رائج نہیں پھر بھی حکومت اور قانون کا اسلامی یا سیکولر ہونا ایک مرکزی بحث کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر اس چیز کا تجزیہ انتہائی ضروری ٹھہرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس ریاست کی بنیاد رکھی اور جن اصولوں کے تحت اسے چلایا اس کی اہمیت کیا ہے اور الٰہی ہدایت سے اس کو کس قدر علاقہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ان ہی کے ارشاد کے مطابق، مکارم اخلاق کی تکمیل کرنا تھا۔ (۸۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کی جملہ خوبیوں کا ایک نمونہ پیش کرنا جس کی پیروی کر کے افراد زندگی کے ہر شعبے میں انسانی قدروں کی بالادستی کو قائم کریں جیسے کہ الٰہیات کا تقاضا ہے۔ ان شعبوں میں سے ریاست اور سیاست ایسا میدان ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی کے امور میں مرکزیت پیدا کر کے ایک تہذیب کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس اہمیت کے باوجود اس چیز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کسی بھی

ریاست میں طرز سیاست کی بنیاد اس کا معاشرہ اور اس سے مربوط دیگر شعبہ ہائے زندگی ہی ہیں۔ لہٰذا اصل مقصد افراد کی زندگیوں کو انسانیت کی خوبیوں سے مزین کرنا ہے تاکہ وہ ایک اعلیٰ تہذیب کو پیدا کرسکیں۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ریاست اور حکومت ذریعہ ہے اعلیٰ انسانی اقدار کو موثر طریقے سے قائم کرنے کا جب کہ اصل مقصد ان اقدار کو افراد کی زندگیوں میں قائم کرنا ہے۔ ایک ریاست قائم کرنے اور حکومت چلانے سے اسلام کے پیش نظر یہی نظریہ ہے جسے پیغمبر اسلام نے ایک نمونے کے طور پر ریاست مدینہ میں قائم کیا۔ لہٰذا سیاست اور ریاست کا تصور اسلام سے ہرگز متعارض نہیں بل کہ اسلامی نظام کے اتمام کا لازمی جز ہے۔ فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة میں یہی پیغام مضمر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشن کے پیش نظر عیسائیوں کو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ ایک نبی ایک ریاست کیسے قائم کرسکتا ہے یا وہ سیاست کو کیسے اپنا سکتا ہے۔ (۸۵) اسی چیز کی بنیاد پر ایک معتدل مستشرق منٹگمری واٹ نے دو کتابیں Muhammad at Medina اور Muhammad at Mecca لکھی ہیں جن کے بین السطور میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے دونوں ادوار میں بہ حیثیت نبی اور حکم راں کے فرق کر رہا ہے کہ مکے میں تو وہ ایک نبی کے طور پر نظر آتے ہیں جب کہ مدینے جاکر وہ ایک حکم ران بن گئے۔ یہ بات بھی اصولی طور پر غلط ہے کیوں کہ اسلام کے پیغام میں شروع سے ہی آفاقیت پائی جاتی ہے۔ یاایھا الناس کے الفاظ جو کہ مکی سورتوں میں بھی عام تھے اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم اور دوسرے قبائل کو دعوت دیتے ہوئے یہ بات اکثر کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ پڑھ لو عرب تمہارے قبضے میں آجائے گا اور عجم تمہیں جزیہ دیا کریں گے۔ (۸۶) یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمانوں کی تعداد سیکڑوں میں بھی نہیں تھی اور مکے سے باہر اسلام کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔

اس غرض وغایت کے بعد اس چیز کا جائزہ لینا ہے کہ ریاست مدینہ کا قیام صرف وحی الٰہی کا تقاضا تھا یا اس کا کچھ تاریخی پس منظر بھی تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات تو بدیہی ہے کہ عرب میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت اس طرح کی متمدن حکومتیں قائم نہیں تھیں جیسے روم اور ایران کی تھیں لیکن یمن، حیرہ اور حضرموت جو کہ جزیرہ نما کے اطراف میں تھے، میں ماضی میں شان دار حکومتیں قائم رہی تھیں۔ البتہ اندرون عرب صحرائی خدوخال کی بہ دولت قبائلی نظام رائج تھا جس میں کہ حکومت کا طرز پایا جاتا تھا۔ ہر دس آدمیوں پر ایک ذمہ دار ہوتا تھا جسے عریف کہتے تھے۔ اسی طرح ہر دس عریفوں پر ایک نقیب ہوتا تھا۔ پورے قبیلے کی سرداری کے لئے ہمیشہ قابلیت کو معیار مانا جاتا تھا۔ مکے میں پانچویں صدی عیسوی میں اس

طرزِ حکومت کی مزید ترقی یافتہ شکل قائم ہوئی جسے آں حضرت ﷺ کے جدامجد قصی بن کلاب نے قائم کیا۔ خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نکل کر بنی جرہم اور ان کے بعد بنی خزاعہ کے پاس چلی گئی تھی۔ قصی نے بنی اسماعیل کو تولیت کعبہ کا اعزاز دوبارہ دلوایا اور قریش کو اردگرد سے لاکر مکہ میں جمع کیا پھر ان کے لئے ایک شہری مملکت کے اصول وضع کئے۔ مختلف شعبے قائم کئے اور انہیں مختلف قبائل میں تقسیم کیا۔ قصی کے بعد ان کے پوتے ہاشم نے اس شہری مملکت کو مزید مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور اردگرد کے قبائل اور حکومتوں سے سفارتی تعلقات قائم کر کے قریش کی تجارت کو محفوظ بنایا۔ ان کے قیصر روم سے بھی دوستانہ تعلقات تھے اور جب کبھی یہ قیصر کے دربار میں جاتے تو وہ اپنے امور کے متعلق ان سے مشورے بھی طلب کیا کرتا تھا۔ قرآن میں یہ جو کہا گیا: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ O اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ O فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ O الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ O (۸۷) اس کا تاریخی پس منظر شہری مملکت مکہ کا اندرونی اور بیرونی طور پر محفوظ ہونا تھا۔

یہ تمام باتیں مدینہ میں قائم ہونے والی ریاست کی بنیاد بنیں بل کہ یوں کہنا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے ساتھ شہری مملکت نے بھی مدینے کی طرف ہجرت کی۔ اس سلسلے میں جو باتیں مدینے میں دہرائی گئیں ان میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلا کام جو مدینے کی ریاست کے ضمن میں کیا وہ مدینے اور اس سے باہر کے قبائل سے معاہدات تھے تاکہ مدینے کے دفاع کو مضبوط کیا جائے۔ دوسری بات یہ تھی کہ جو لوگ مکے کی شہری ریاست میں مختلف ذمے داریوں کو سنبھالے ہوئے تھے مدینے میں وہی ذمے داریاں ان کے سپرد کی گئیں۔ مثال کے طور پر حضرت ابوبکرؓ کے قبیلے بنی تیم کے پاس عدالتی امور کا شعبہ تھا تو مدینے میں بھی انہیں یہ ذمے داری سونپی گئی۔ حضرت عمرؓ کے قبیلے بنی عدی کے پاس مکے کی سفارت ہوا کرتی تھی تو مدینے میں بھی یہ کام حضرت عمرؓ کے سپرد ہی کیا گیا۔ حتیٰ کہ فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ کی کنجیاں بنی عبدالدار کے عثمان بن طلحہ کے پاس تھیں تو یہ ان ہی کو سونپ دی گئیں اور آج تک ان کے خاندان کو یہ اعزاز حاصل ہے حال آں کہ عثمان بن طلحہ فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے تھے اور ہجرت کے وقت جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے کعبے میں الوداعی عبادت کی اجازت چاہی تھی تو عثمان نے ان کے لئے کعبہ کا دروازہ نہیں کھولا تھا۔ (۸۸)

ابوطالب کی وفات کے بعد بنی ہاشم کی سرداری ابولہب کے پاس چلی گئی جو آپ ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ اسی سال حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا جن کا کہ قریش میں بڑا وقار تھا۔ اس سے قریش کی مخالفت مزید بڑھ گئی۔ اس صورت حال میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے باہر اسلام کا مرکز قائم کرنے کی طرف توجہ

دی۔ اس سلسلے میں پیش رفت مدینے کے لوگوں سے ملاقات کے بعد ہوئی۔ سب سے پہلے مدینے سے سوید بن الصامت کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی جو آپ کی باتوں سے متاثر ہوئے لیکن ان کے اسلام لانے کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد قبیلہ بنی اوس کی ایک شاخ بنی عبدالاشہل کے کچھ لوگ حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ ملے اور انہیں اپنی دعوت پیش کی۔ انہوں نے بھی توجہ سے سنا لیکن انہیں زیادہ دل چسپی اس حربی معاہدے میں تھی جو وہ خزرج کے مقابلے کے لئے قریش سے کرنے آئے تھے۔ (۸۹)

اس کے بعد نبوت کے گیارھویں سال مدینے سے آنے والے چھ حجاج نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا لیکن اس میں مستقبل سے متعلق کوئی بات طے نہیں ہوئی۔ نبوت کے بارہویں سال بہ شمول ان پانچ حضرات کے جنہوں نے پچھلے سال اسلام قبول کیا تھا کل بارہ لوگوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بل کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ پیغمبر اسلام کی سرپرستی میں اسلام کے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے ان کا ہر حالت میں ساتھ دیں گے۔ (۹۰) اسے بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو مبلغ اور اپنا نائب بنا کر مدینے روانہ کیا۔ نبوت کے تیرہویں سال مدینے سے ۷۲ لوگوں نے عقبہ ہی کے مقام پر اسلام قبول کیا اور اب کے رسول اللہ ﷺ کے لئے لڑنے مرنے کی بیعت کی۔ اسے بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ (۹۱) ان ملاقاتوں کی ایک اہمیت یہ بھی تھی کہ ان میں شامل لوگ اپنے قبائل کے سرکردہ لوگ تھے۔ اس بیعت کے نتیجے میں ایک ایسی ریاست وجود میں آئی جس کے لوگ اپنے حکم راں سے ایک معاہدے میں شریک ہوئے تھے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ریاست کے قیام سے قبل حکم راں سے اس طرح کا معاہدہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کو مدینے آنے کی دعوت ملی۔ صحابہ کرامؓ ایک ایک کر کے مدینے روانہ ہونے لگے اور آخر میں آپ ﷺ بھی حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینے روانہ ہوگئے۔

مدینہ بقیہ عرب کی طرح قبائلی کش مکش کی آماج گاہ تھی۔ خاص طور پر اوس اور خزرج کے درمیان پرانی مخاصمت چل رہی تھی جس پر بعاث کے نام سے ایک جنگ بھی ہو چکی تھی۔ ہجرت سے ذرا پہلے دونوں کے درمیان صلح ہوگئی اور اس کے نتیجے میں دونوں قبیلوں کا مشترکہ سربراہ بنانے کی تجویز زیر غور تھی اور اس کے لئے عبداللہ بن ابی سلول کا نام نمایاں تھا۔ یہ نوبت نہ آسکی اور رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اسی کے ردعمل کے طور پر عبداللہ بن ابی بہ ظاہر مسلمان ہوتے ہوئے مار آستین بن گیا اور رئیس المنافقین کہلایا۔ اوس وخزرج نے جو کہ اسلام لانے کے نتیجے میں انصار بنے رسول اللہ ﷺ کی سیادت کو تسلیم کرلیا اور رسول اللہ ﷺ نے ہجرت سے قبل ہی مدینے کا داخلی نظم ونسق طے کردیا۔ انصار کے

قبیلوں کے نقیب مقرر کر کے مہاجرین کو انصار کے مختلف قبائل کا حصہ بنا دیا جسے مواخات کا عمل کہا جاتا ہے۔ مواخات عرب کے ایک قدیم ادارے کا احیا تھا جسے ولا کہتے تھے۔ ولا میں کوئی شخص اپنے قبیلے سے تعلق ختم کر کے کسی قبیلے سے اپنا تعلق قائم کر سکتا تھا، بہ شرطے کہ دوسرا قبیلہ اسے قبول کر لے۔ اس سے وہ شخص نئے قبیلے کا فرد بن جاتا تھا۔ جو شخص اس طرح کا تعلق قائم کرتا تھا وہ مولی الموالات کہلاتا تھا۔

میثاق مدینہ: مدینہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کا سب سے اہم اقدام مدینے کو ایک سیاسی وحدت بخشنا تھا جو میثاق مدینہ کے ذریعے عمل میں آئی۔ اسے بعض لوگوں نے میثاق، بعض نے معاہدے اور بعض نے کتاب رسول اللہ ﷺ للانصار والمہاجرین کا نام دیا ہے۔ کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خیال غالب آتا ہے کہ اس کی تیاری میں آپ ﷺ نے تمام قبائل سے مشاورت بھی کی ہوگی۔ حالات وواقعات کے تجزیے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ معاہدہ دراصل دو الگ الگ معاہدات تھے، جن کو شقوں کو بعد میں یک جا کر کے لکھ دیا گیا، جس سے یہ گمان ہوا کہ یہ ایک معاہدہ تھا۔ یہ نتیجہ جدید مورخین نے بنیادی ماخذوں سے حاصل ہونے والی معلومات کی جانچ پرکھ سے نکالا ہے۔ پہلا معاہدہ مہاجرین اور انصار کے قبائل کے مابین ہجرت سے فوراً بعد طے پایا، جب کہ دوسرا معاہدہ غزوہ بدر کے بعد قبائل یہود کے ساتھ طے پایا۔ اس کا دستاویزی ثبوت ابوداود کی سنن میں ملتا ہے۔ عربی کی مشہور لغت لسان العرب میں بھی دو کتابوں کا ذکر ہے کتاب للمہاجرین والانصار اور کتاب للیہود۔ (۹۲) اس کے علاوہ قدیم مصنفین میں سے ابن منظور افریقی بھی اس کو دو دستاویزات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے ۵۲ قرار دی ہیں۔ مشہور ڈچ مستشرق وینسنک نے ۴۷ اور بعض مصنفین نے ۵۶ دفعات قرار دی ہیں۔ بیش تر جدید مورخین نے اسے انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے۔

اس معاہدہ کی پہلی شق اس طرح سے تھی:

هذا كتاب من محمد النبي بين المؤمنين والمسلمين من قريش ويثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهدمعهم انهم امة واحدة من دون الناس

یہ معاہدہ محمد ﷺ کی طرف سے قریش اور یثرب کے مومنین اور مسلمین اور ان لوگوں کے درمیان ہے جو ان کی اتباع کریں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔ یہ سب مل کر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ایک امت ہیں۔

اس طرح سے اس معاہدے کی داغ بیل ایسے لوگوں کے درمیان پڑی جن کی گروہ بندی کی بنیاد ایک نظریہ تھا نہ کہ رنگ نسل اور وطن۔ بعد میں اس میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو جن میں کہ یہود قابل

ذکر تھے کو بھی شامل کیا گیا۔ جب بھی کسی غیر مسلم قبیلے کو اس میں شامل کیا جاتا تو ان کے لئے امة مع المومین کے الفاظ استعمال کئے جاتے یعنی وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک علیحدہ حیثیت سے ایک گروہ ہیں اور ایسا نہیں کہ ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ اگر ایسا کچھ مقصود ہوتا تو یہ الفاظ اس طرح سے ہوتے امة من المومنین۔ (۹۳)

جب اس معاہدے میں یہود کے قبائل شامل ہونا شروع ہوئے تو ان کے ضمن میں دو دفعات بہت اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ جو یہودی ہمارے اس معاہدے میں ہماری پیروی کریں گے ان کو بھی اسی طرح سے مدد فراہم کی جائے گی اور ان کو وہی مساوات فراہم کی جائیں گی جو قریش اور انصار کو کی جارہی ہیں۔ دوسری یہ کہ اگر یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لئے کہا جائے گا تو وہ جنگ کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ اس لئے کہ ان کا بھی دفاع ہوگا۔ یہودیوں کے سات قبائل کا ذکر ہے جو اس معاہدے میں شامل ہوئے۔ معاہدے میں ایک شق ایسی ہے جسے تمام قبائل کے حوالے سے دہرایا گیا۔ وہ یہ تھی کہ قبائل اپنے سابقہ طرز عمل کے مطابق دیت کی ادائیگی کرتے رہیں گے۔ اور معاہدے کے پہلے حصے کی آخری شق یہ تھی کہ غیر منصوص امور میں اختلاف کی صورت میں آخری فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد ﷺ کا ہوگا۔ اس سلسلے میں سب کے لئے مساوات کے اصول کو رائج کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ (۹۴)

داخلی نظم ونسق کے اس ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے مدینے سے باہر کے قبائل پر توجہ دی اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے رابطوں کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی سفارت ایک دستے کی شکل میں حضرت حمزہؓ کی سربراہی میں مدینے کے جنوب میں آباد بنی ضمرہ کی طرف بھیجی گئی جن سے ایک معاہدہ طے پایا جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے بعد مدینے کے شمال میں آباد قبیلہ جہینہ سے معاہدہ ہوا۔ اس کے علاوہ جنوب میں جو قبائل مکے کی راہ میں پڑتے تھے ان سے بھی معاہدات ہوئے۔ مغرب میں موجود ایک اہم قبیلہ مزینہ بھی معاہدے میں بندھ گیا۔ اس طرح سے یہ معاہدات کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا جو ریاست مدینہ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے قبائل کے درمیان تھا۔ ان معاہدات سے مدینے کے دفاع کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں کو امن وسکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

اس کے بعد ریاست کے شعبہ جات قائم کرنے کا مرحلہ درپیش آیا تو سب سے پہلے شعبہ خارجہ کی تنظیم کی گئی، کیوں کہ اولین ضرورت اس نئی ریاست کے دفاع کی تھی۔ اس کی ذمے داری حضرت عمرؓ کے سپرد تھی جن کا قبیلہ شہری مملکت مکہ میں بھی سفارت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نوزائیدہ ریاست کی خارجہ پالیسی کے تین بنیادی اہداف تھے۔ اولاً اسلام کی دعوت کو پھیلانا، اس لئے معاہدات میں یہ بات بہ تصریح

موجود ہوتی تھی کہ مسلمان داعی جہاں کہیں بھی جائیں گے ان کا راستہ نہیں روکا جائے گا۔ ثانیاً عرب میں امن وامان قائم کرنا جس کے پیش نظر قبائل کو حلیف بنانے کا عمل شروع ہوا۔ ثالثاً عرب میں اسلامی ریاست کا اثر قائم کرنا۔ اس کے علاوہ تالیف قلب ایک اہم عنصر تھا جس کا مقصد انسانی ہم دردی کی بنا پر مخالف قبائل کی ضرورت کے وقت امداد کرنا تھا۔ مکے والوں کو قحط کے دنوں میں راشن مہیا کرنا اسی پالیسی کا حصہ تھا۔ مختلف قبائل اور حکومتوں سے سفارت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جس کے لئے مناسب لوگوں کو سفیر منتخب کیا گیا۔ مثال کے طور پر حضرت دحیہ کلبیؓ بنو کلب سے تھے جو قیصر روم کا باج گزار تھا، اس لئے انہیں سفارت کے لئے قیصر روم کے دربار میں بھیجا گیا۔ (۹۵) ان کے علاوہ عمرو بن امیہ الضمری تھے جو نجاشی کے دربار میں سفیر کے طور پر جاتے تھے۔ عمرو بن العاص جب اسلام لے آئے تو انہیں بھی سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ جو سفیر باہر سے دربار رسالت میں آتے تھے انہیں تحائف سے بھی نوازا جاتا اور اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی باقاعدہ ہدایت موجود ہے کہ **اجیزو الوفود کما کنت اجیزھم** یعنی جس طرح سے میں وفود کو انعامات دیا کرتا تھا تم اس کا سلسلہ جاری رکھنا۔

خارجہ امور میں ایک شعبہ مراسلات کا بھی تھا جس کے ذمے رسول اللہ ﷺ کی خط وکتابت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سترہ دن میں سریانی سیکھی، تاکہ جو خطوط سریانی یا عبرانی رسم الخط میں ہوں ان کو قابل اعتماد آدمی پڑھ کر اس کا جواب لکھ سکے۔ حضرت علیؓ عام طور پر معاہدات کو تحریر کیا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ سمیت کئی اہم معاہدات کی کتابت حضرت علیؓ نے فرمائی۔ اس کے علاوہ بیرونی وفود اور سفرا کی مہمان داری کے لئے بھی انتظامات مختص کئے گئے۔ اس سلسلے میں حضرت بلال اور بعد میں معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی کو ذمے دار بنایا گیا۔ مہمانوں کی رہائش کا انتظام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ایک مکان میں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت رملہؓ بنت حارث کے مکان کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، جس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ (۹۶) حضرت مغیرہ بن شعبہ کھانے وغیرہ کے انتظام کے سربراہ تھے۔ ۹ ہجری میں حضرت خالد بن سعید کو اس شعبے کی ذمے داری سونپی گئی۔ بڑے وفود کے انتظام کی ذمے داری حضرت عمرؓ کے سپرد کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر جب قبیلہ مزینہ کا وفد مدینے آیا تو حضرت عمر کو ان کے دیکھ بھال کو کہا گیا۔ (۹۷)

خارجہ امور کے حوالے سے بین الاقوامی قانون بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کچھ عرصے سے دنیا میں بین الاقوامی قانون کی ایک شاخ International Humanitarian کا بہت زور ہے اور اسے مغربی

فکر کا کارنامہ سمجھا جارہا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اسلام کی پہلی ریاست کی دین ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی دستے کو روانہ کرتے تو اسے عامۃ الناس اور بے ضرر لوگوں کے بارے میں خصوصی ہدایت کرتے کہ عورت، بچے، بوڑھے، عبادت گزار حتی کہ ہتھیار ڈالنے والے اور فرار ہونے والے سپاہی کو قتل نہ کیا جائے۔ (۹۸) اسی فکر کو آج کل جنگ کے حوالے سے دنیا میں قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن اس پر عمل صاحب اختیار کے ارادے پر ہے۔

اس طرح مختلف امور کی انجام دہی کے لئے مختلف شعبے قائم ہوئے، جن پر مناسب لوگوں کا تقرر کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی حیثیت وزیر اول کی سی تھی جن سے رسول اللہ ﷺ ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے۔ (۹۹) دفاعی امور کو بھی توجہ سے طے کیا جاتا تھا۔ جب کسی غزوے کے لئے تیاری کی جاتی تو شرکا کی ایک فہرست بنائی جاتی اور اس کی ایک نقل مدینے میں رکھی جاتی اور اصل دستے کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس امر کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے کہ جب ایک صحابی کی نئی نئی شادی ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ میری بیوی کہتی ہے کہ مجھے حج کراؤ جب کہ میرا نام غزوے کے لئے لکھا جاچکا ہے۔ جنگی مہمات کے پیش نظر مدینے کی مردم شماری بھی کروائی گئی۔ مختلف غزوات کے شرکا کی تعداد جواب تک ہمیں ملتی ہے وہ اسی امر کا نتیجہ ہے۔ اس انتظام کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دفاع کا باقاعدہ ایک شعبہ قائم تھا۔ حرب وضرب کے فن پر بھی توجہ دی جاتی اور ایسا اسلحہ جو مسلمانوں کے پاس نہ ہوتا اس کی فراہمی کے لئے اقدامات کئے جاتے۔ منجنیق اور دبابہ (۱۰۰) جو قلعوں کو توڑنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، کا استعمال یمن میں جانا جاتا تھا رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو ہدایت کی کہ وہ یمن سے اس کا بنانا اور استعمال سیکھ کر آئیں۔

اسی طرح سے سراغ رسانی کو بھی باقاعدہ طریقے سے منظم کیا گیا تھا۔ (۱۰۱) بعض قبائل میں کچھ لوگ مستقل طور پر اس کام پر مامور تھے کہ مدینے کے خلاف ہونے والی ہر قسم کی منصوبہ بندی کی خبر دیں۔ حضرت عباسؓ کے بارے میں کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش کی تیاریوں سے رسول اللہ ﷺ کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض مواقع پر لوگوں کو خاص طور پر دشمن کا احوال معلوم کرنے کے لئے بھیجا جاتا۔ غزوہ بدر کے بیان میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چرواہے سے جسے کہ صحابہؓ پکڑ لائے تھے قریش کے لشکر سے متعلق پوچھ گچھ کی۔ کتاب المغازی میں علامہ واقدی نے تقریباً ہر صفحے پر ایک آدھ بات ایسی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سراغ رسانی کا ایک منظم اور موثر ادارہ موجود تھا۔ (۱۰۲)

صیغہ عدل کا شعبہ بھی بہت اہمیت کا حامل تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے بھی خاص حکمت عملی وضع کی۔ جس طرح سے آج کی دنیا میں سربراہ مملکت کو اپیلٹ اختیارات حاصل ہوتے ہیں اس طرح سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی اعلیٰ ترین عدالتی اختیار تھے۔ اس چیز سے ہٹ کر انہوں نے مختلف قبائل کے لئے قاضیوں کا بھی تقرر فرمایا۔ لہٰذا مشہور ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت عمرؓ مدینے کے قاضی تھے۔ (۱۰۳) یہ قاضی اپنی اپنی عمل داریوں میں فیصلہ کرتے اور بعض دفعہ اپنے فیصلے کو تصدیق کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجتے۔ (۱۰۴) بعض دفعہ رسول اللہ ﷺ از خود معاملے کی تہہ تک پہنچتے جسے آج کل کی عدالتی اصطلاح میں suo moto کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ ایک قبائلی سردار کا قتل ہو گیا اور ورثا کو دیت ادا کر دی گئی۔ اس واقعے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دے دی گئی تو آپ ﷺ نے اس علاقے کے ذمے دار کے نام ایک نامہ بھیجا کہ معلوم کیا جائے کہ اس دیت میں مقتول کی بیوہ کو بھی حصہ دیا گیا ہے؟ اسے حصہ دلوایا جائے اور اس امر سے متعلق مجھے مطلع کیا جائے۔ اس طرح سے رسول اللہ ﷺ نے ایک موثر اور مرکزیت کا حامل صیغہ عدالت قائم فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے بہ طور قاضی کے جو فیصلے کئے وہ الگ سے جمع کئے گئے ہیں۔ اقضیۃ الرسول کے نام سے ایک قدیم ترین کتاب ہے جو اسپین کے ایک بزرگ امام محمد بن الفرج الاندلسی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ''دربار رسول کے فیصلے'' کے نام سے ملتا ہے۔ (۱۰۵)

عدالت سے ہی متعلق ایک شعبہ Ombudsman کا ہے جس کے بارے تصور پایا جاتا ہے کہ اس کا آغاز سویڈن سے ہوا۔ دوسرے تصورات کی طرح یہ بھی درست نہیں، یہ شعبہ رسول اللہ ﷺ نے ہی حضرت عمرؓ کی نگرانی میں قائم کیا تھا جنہوں نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ یہ شعبہ اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے خلاف عوام کی شکایت سن کر ان کا ازالہ کرتا تھا۔ یورپ والوں نے اسے اسپین سے سیکھا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ (۱۰۶) صیغہ احتساب بھی اس زمانے میں قائم ہوا تھا، جو ایک ایسا نیم عدالتی ادارہ ہے جو اس کام کے لئے قائم کیا جاتا تھا کہ عام معاشرتی اخلاق کا تحفظ کرے اور اسلام کے معاشرتی اخلاق کے بارے میں نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمے داریاں سرانجام دے۔

ریاست مدینہ میں غیر مسلم رعایا کو بھی ریاست کے کام میں شریک کیا جاتا تھا، لیکن ان ذمے داریوں میں جو شریعت کے فہم سے متعلق نہیں ہوتی تھیں۔ ان ذمے داریوں میں زیادہ تر فنی مہارت کے کام آتے تھے۔ غیر مسلم قبائل جو مسلمانوں سے معاہدے میں شریک ہوتے ان کے ساتھ طے ہوتا کہ

مذہب کے حوالے سے انہیں کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح ان قبائل کے سرداروں اور دیگر عہدیداروں کو من وعن اپنی ذمے داریوں پر قائم رکھا گیا اور انہیں برطرف نہیں کیا گیا۔ بل کہ انہیں یقین دہانی کرادی گئی کہ جو شخص ان کے قبیلے سے نہیں ہوگا اسے ان پر حاکم مقرر نہیں کیا جائے گا۔ یہ علاقائی خود مختاری کی عمدہ مثال تھی جسے قائم کرکے آج بھی بہت ساری غلط فہمیوں کے پیدا ہونے سے بچا جاسکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اس ضمن میں ایک اہم باب ہے جس میں وہاں کے نمائندوں کو نظر انداز کرکے غیروں کو ان پر مسلط کیا گیا۔

مدینے کی ریاست ایک کثیر القبائل، کثیر المذہبی اور کثیر الثقافتی حکومت تھی جس میں بالادستی شریعت کو حاصل تھی۔ آخری قانون اللہ اور اس کے رسول کا فرمان تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس میں بہ طور حاکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ تمام فریقین کو داخلی خود مختاری بھی دی گئی اور سابقہ روایات کی اچھی چیزوں کو اس میں جگہ دی گئی۔ اسلام کا ایک مزاج جو مدینہ منورہ کے دور میں بہت نمایاں ہوا وہ دوسری اقوام اور دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کی مثبت اور تعمیری چیزوں کو اپنا لینے اور اسلامی نظام میں سمو لینے کا ہے۔ (۱۰۷)

حواشی

۱۔ علامہ اقبال کا شعر لوح بھی تو قلم بھی تو، تراوجود الکتاب اسی کا مصداق ہے۔ یہ بات کوئی مبالغہ نہیں بل کہ وہی بات ہے جو سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فرمائی کہ کان خلقہ القرآن، آپ ﷺ کے اخلاق عین قرآن تھے۔ (حدیث عائشہ: مسند احمد، معجم الکبیر طبرانی، دلائل النبوۃ بیہقی، مشکل الآثار طحاوی)

۲۔ ایک طویل حدیث میں جسے حضرت علیؓ نے روایت کیا اور محدث طبرانی نے اس کی تخریج کی ہے، قرآن کے دس اوصاف بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لاتنقضی عجائبہ یعنی قرآن مجید کے عجائب وغرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید سے ہمیشہ نئے نئے مطالب اور نئے نئے معنی نکلتے چلے آئیں گے اور ہر آنے والا دن قرآن پاک کے حقائق اور معارف کی ایک نئی دنیا لے کر آئے گا۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم قرآنی ہر دور میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتا رہا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے بطن میں ابھی کتنے عوالم قرآنی پنہاں ہیں۔

۳۔ قاضی محمد علی تھانوی نے اپنی کتاب کشاف اصطلاح الفنون میں سیرت کی تعریف اس طرح سے کی ہے: ثم غلبت فی الشرع علی طریقة المسلمین فی المعاملة مع الکافرین والباغین وغیرهما من المستامنین والمرتدین واهل الذمة "شریعت کی اصطلاح میں اس لفظ کا زیادہ استعمال مسلمانوں کے اس طریقے پر ہوتا ہے جو وہ کفار، غیر مسلم محاربین، مسلمان باغی، مرتدین، اہل ذمہ اور دوسروں سے معاملہ اور طریق کار کے بارے میں اختیار کرتے ہیں'' یہی بات فتح القدیر میں فقیہ کمال بن ھمام نے بھی لکھی ہے۔

۴۔مغربی دنیا آج ہیوگوگروشیس (Hugo Grotius) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم قرار دیتی ہے، جس نے سترھویں صدی عیسوی میں قانون بین الاقوامی پر پہلی باقاعدہ کتاب لکھی تھی۔لیکن گروشیس سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے فقہائے اسلام نے قوانین کی تدوین اور ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا اور گروشیس کی پیدائش سے ۸۶۰ سال پہلے امام محمد بن حسن شیبانی بین الاقوامی قانون پر تین کتابیں لکھ چکے تھے۔

۵۔عروہ بن زبیرؒ اور موسیٰ بن عقبہ کی تحریریں مغازی بھی کہلاتی تھیں اور سیر بھی۔

۶۔''آں چہ متعلق بہ وجود پیغمبر ماﷺ وصحابہ کرام وآل عظام است، واز ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات، آں را سیرت گویند''۔

۷۔Clash of Civilization سرد جنگ کے بعد کا مقبول ترین نظریہ ہے جو ہن ٹنگ ٹن نے ایک مقالے کی شکل میں پیش کیا، بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس میں مصنف نے ان حقائق کی نشان دہی کی ہے جو اس کے بہ قول تہذیبوں کے تصادم کے امکانات کو یقینی بنا رہے ہیں۔

۸۔کتب احادیث میں یہ نظیہ ایک جگہ موجود نہیں بل کہ اجزا کی صورت میں ہے البتہ سیرت کی ایک کتاب سبل الھدی والرشاد میں ان اجزا کو اکٹھا کیا گیا ہے۔عدل وانصاف کے ضمن میں ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق دنیا کی تمام اقوام اور ممالک کو جن مشکلات سے واسطہ رہا ہے، ان میں سے ایک اہم مشکل قوموں کی باہمی عصبیت کا مسئلہ ہے، جب کہ دوسری چیز دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان کش مکش ہے۔ماضی میں انسانوں کا جتنا بھی خون بہا وہ زیادہ تر انہیں وجوہات کی بنا پر بہا تھا۔سرکار دو عالم نے جب اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ دونوں مشکلات بہ درجہ اتم موجود تھیں۔قومی عصبیت تو ایک بڑی سطح پر ہوتی ہے عربوں میں تو قبائل کی بنیاد پر شدید عصبیتیں موجود تھیں۔جہاں تک امیروں اور غریبوں کا تعلق ہے تو ان کی کش مکش سے تو پورے عرب کی جاہلی شاعری بھری پڑی ہے۔صعلوک کے معنی کنگال کے ہیں اور وہاں صعالیک کی ایک پوری قوم ہوا کرتی تھی اور ان کا کام لوٹ مار کرنا ہوتا تھا۔ان حالات میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھتے ہی دیکھتے ان مسائل کو ایسے حل کر دیا جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔انسانوں کی مدون تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس نے اتنے کم وقت میں ان پہاڑ جیسی مشکلات کو حل کر دیا ہو۔یہ سب کس طرح ہوا اس راز کو جاننے کے لئے مطالعہ سیرت کی ضرورت ہے۔

۹۔قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا تو اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس سفارش آئی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔

۱۰۔یہ روایت متعدد جگہ پر آئی ہے، صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کی شکل میں یہ روایت موجود ہے لیکن یہاں اور دیگر جگہوں پر بھی صنعا سے حضرموت تک کا ذکر ہے۔بعد میں حضرت حجر بن عدی نے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھا۔سیرت النبی۔از شبلی نعمانی

۱۱۔یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام میں جس علم کو فرض قرار دیا گیا ہے وہ معرفت الٰہی کا علم ہے جو ہر سطح کے انسان پر اس کی ذہنی استطاعت کے مطابق فرض ہے۔پڑھے لکھوں کے لئے دیگر علوم البتہ معرفت الٰہی میں ترقی کا

ذریعہ بن سکتے ہیں بل کہ وہ اسی بات کے مکلف ہیں کہ دیگر علوم کو اس لئے پڑھیں کہ ان پر معرفت الٰہی زیادہ سے زیادہ منکشف ہو سکے۔

۱۲۔ جدید تاریخ نویسی میں ماضی کے واقعات کو عینی شاہدین سے ثابت کرنا ایک لازمے کی حیثیت رکھتا ہے، اسماء الرجال اس سے بھی بڑھا ہوا علم ہے جس میں ایک سے زیادہ واسطوں سے ایک روایت کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت ہے انما الاعمال بالنیات۔ یہ سات سو اسناد سے رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔

۱۳۔ ہیروڈوٹس کی ایک تاریخ کی دست یابی پر، جس کے بارے میں کوئی شہادت نہیں کہ یہ اس نے خود بھی لکھی ہے، اس کی تمام زندگی کی معلومات کو مرتب کیا گیا ہے اور اس پر کبھی کسی قسم کا اعتراض نہیں اٹھایا گیا اور اسے بابائے تاریخ کا لقب عطا کیا گیا۔

۱۴۔ رسول اللہ ﷺ کے اس طرح جامع الصفات ہونے کو علامہ اقبال نے بڑے خوب صورت انداز سے شعر کی زینت بنایا ہے:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

۱۵۔ آسمانی مذاہب کو قرآن پاک نے تسلیم کیا ہے اور خود کو نہ صرف ان کا مصداق قرار دیا ہے بل کہ مھیمن بھی قرار دیا ہے، ومھیمنا علیہ (المائدۃ:۴۸) کہ قرآن ان کا محافظ اور ان پر حاوی ہے۔

۱۶۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ کہہ دیجئے اگر تمہیں اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ (آل عمران:۳۱)

۱۷۔ عربی میں طبقے سے مراد نسل (generation) کے ہیں۔ یعنی زمانے کے اعتبار سے صحابہ کے مختلف طبقے۔

۱۸۔ سیرت کے عنوانات کی وسعت کا اندازہ قائم کرنے کے لئے ایک متوسط حجم کی کتاب کے مندرجات اس طرح سے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا خاندان، آپ کا قبیلہ، آپ کے فضائل، معجزات، رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں مسلمانوں پر جن آداب اور حقوق کا فریضہ عائد ہوتا ہے، آپ کی اولاد مبارکہ، آپ کے جدات یعنی دادیاں، آپ کے ننھیال، آپ کی نانیاں، آپ کے خادم، آپ کی خادمائیں، جن معزز خواتین نے آپ کی پرورش کی اور دودھ پلایا، آپ کی عادات، آپ کے خصائل، آپ کے اخلاق، ازواج مطہرات، آپ کے غلام، آپ کا اسلحہ، آپ کے جانور، ان موضوعات کی حیثیت ظاہر ہے ضمنی مباحث کی ہے، اصل مباحث میں سے اہم ترین یہ ہیں: وقائع سیرت، مغازی اور مہمات، سنن زوائد، تبلیغ دین، قبائل سے روابط، معاہدات، معیشت وتجارت، قانون وشریعت، انتظامات وارادات، وثائق ودستاویزات، آپ کے سفراء اور عمال، آپ کے صحابہ، آپ کے عسکری انتظامات، شہر مدینہ کا بندوبست، ازواج مطہرات کے گھروں کا بندوبست وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۔ علم الانساب سے مراد نسب ناموں کے محفوظ کرنے کا علم ہے۔ یہ چیز صرف افراد اور خاندانوں تک محدود نہ تھی بل کہ اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ لہٰذا عربوں میں یہ بات بڑی غیر مانوس اور

ناقابل تصور تھی کہ کسی شخص کا نسب معلوم اور متعین نہ ہو۔ لہٰذا کوئی شخص اپنے نسب کے بارے میں لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کے نسب کے بارے میں جو شکوک وشبہات پیدا کئے ہیں علم الانساب کے جاننے والے کے لئے ان کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

۲۰۔ رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں عدنان وہ شخصیت ہیں جن تک سلسلہ نسب میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام تک خود رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق سلسلہ نسب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ البتہ طے ہے کہ وہ بنو اسماعیل میں سے تھے۔ عدنان تک انساب کے درست ہونے کے باعث بنو اسماعیل کو بنو معد بن عدنان اور اس نسبت سے عدنانی قبائل کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۱۔ قصی بن کلاب نے مکہ سے باہر بسنے والے قبائل کو مکہ میں لاکر بسایا لہٰذا قریش کا لقب ان سے منسوب کیا جاتا ہے کیوں کہ لفظ قریش کے ایک معنی جمع کرنے کے ہیں۔ لیکن معروف روایات قریش کا لقب رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں سے فہر بن مالک سے منسوب کرتی ہیں۔

۲۲۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، جلد اول، لاہور۔ مکتبہ عثمانیہ: ص ۵۵۔ بہ حوالہ ابن کثیر۔ مولانا کاندھلوی نے اس کے علاوہ بھی کچھ شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں سے تھے اور کسی نہ کسی حیثیت کے مالک تھے۔

۲۳۔ نمونے کے طور پر ہند بن ابی ہالہ کی طویل روایت سے چند جملے درج ذیل ہیں: رسول اللہ ﷺ اپنی ذات والا صفات کے اعتبار سے بھی شان دار تھے اور دوسرے کی نظروں میں بھی بڑے جچنے والے تھے۔ آپ کا چہرہ مبارک ماہ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ کا قد کسی متوسط قد والے سے کسی قدر طویل اور بہت لمبے انسان سے نسبتاً کم تھا۔ سر اعتدال کے ساتھ بڑا تھا۔ سر کے بال کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ اگر اتفاقاً مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ تکلف سے مانگ نکالنے کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا رنگ نہایت چمک دار، پیشانی کشادہ، ابرو خم دار، باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جدا جدا تھے۔ دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو ناگواری کے وقت ابھر جاتی تھی۔ ناک بلندی کی طرف مائل تھی۔ اس پر ایک چمک اور نور محسوس ہوتا تھا۔ پہلی بار دیکھنے والا آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا، لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا کہ یہ حسن اور چمک کی وجہ سے نسبتاً زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے ورنہ فی نفسہٖ اتنی بلند نہیں تھی جتنی معلوم ہوتی تھی۔ آپ کی ڈاڑھی بھرپور اور گنجان تھی۔ آنکھ کی پتلی نہایت سیاہ تھی۔ رخسار ہموار اور ہلکے تھے۔ آپ کا دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا، یعنی تنگ نہ تھا۔ دندان مبارک باریک اور آب دار تھے۔ سامنے کے دانتوں میں ہلکا سا فاصلہ بھی تھا۔ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لکیر تھی۔ گردن ایسی خوب صورت اور قدرے لمبی تھی جیسے موتی کی گردن صاف تراشی ہوئی ہوتی ہے۔ رنگت چاندی کی طرف صاف اور خوبصورت تھی۔ آپ کے اعضا نہایت معتدل اور پر گوشت تھے۔ بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ پیٹ اور سینہ ہموار تھے۔ سینہ فراخ اور کشادہ تھا۔ دونوں مونڈھوں کے درمیان فاصلہ قدرے زیادہ تھا۔ جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور مضبوط تھیں۔ بدن کے وہ حصے جو عموماً کپڑوں سے باہر رہتے تھے وہ بھی نہایت روشن اور چمک دار تھے۔

بدن پر چھاتیوں کے بالائی حصے کے علاوہ بال نہیں تھے۔ البتہ دونوں بازوں، کندھوں اور سینے کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ کلائیاں دراز تھیں۔ ہتھیلیاں دراز اور پر گوشت تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں۔ آپ کے تلوے قدرے گہرے اور قدم ہموار تھے۔ جب آپ چلتے تو قوت کے ساتھ قدم اٹھاتے اور ذرا آگے کو جھک کر چلتے۔ قدم مبارک زمین پر آہستہ لیکن جم کر پڑتا۔ آپ تیز رفتار تھے اور کشادہ قدم رکھتے تھے۔ جب آپ چلتے تو گویا ایسا معلوم ہوتا کہ بلندی سے پستی کی طرف آرہے ہیں۔ جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے توجہ فرماتے۔ نظریں عموماً نیچی رہتیں۔ آپ کی نگاہیں آسمان کی نسبت عموماً زمین کی طرف زیادہ مائل رہتیں۔ آپ کی عادت عموماً گوشہ چشم سے دیکھنے کی تھی۔ صحابہ کرام کو چلتے وقت اپنے سے آگے رکھتے اور خود پیچھے رہتے۔ جس سے ملتے اس کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ آپ زبان کے سچے اور طبیعت کے نرم خو تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا۔ جو آپ کے ساتھ جتنا زیادہ رہتا وہ آپ کی محبت میں اتنا ہی پختہ ہو جاتا۔ آپ اکثر و بیش تر گہری سوچ میں رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم آپ کو مسلسل کھائے جا رہا ہے۔

۲۴۔ اتنے کم صحابہ کے حلیہ مبارک روایت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کا دور آیا جنہوں نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا اس وقت تک صحابہ کی بیش تر تعداد دنیا سے رخصت ہو چکی تھی جو زندہ تھے انہوں نے تابعین کو یہ معلومات فراہم کیں۔

۲۵۔ اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ انسانی حقوق کی اصطلاح کو جانا جائے۔ یہ جدید دور کی وضع کردہ اصطلاح ہے جس کے مطابق انسان مذہب کی قید سے آزاد ہے، لہٰذا جدید اصطلاحات کو اسلامی تصورات سے منسلک کرتے ہوئے ان کے پس منظر کی وضاحت ایک ضروری چیز ہے۔

۲۶۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک مرتبہ چار قسم کے گناہوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ جب انسان یہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکل جاتا ہے اور جب توبہ کرتا ہے تو دوبارہ اس کے دل میں ایمان اس طرح داخل ہو جاتا ہے۔ روایت کرنے والے صحابی نے فرمایا فشبك بين اصابعه یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر آپ نے اس طرح فرمایا۔ صحابہ کے زمانے سے اب تک اس حدیث کو بیان کرنے والا ہر شخص تشبیک کے اس عمل کو کر کے دکھاتا ہے۔ یہ بھی حدیث کا حصہ ہے۔

۲۷۔ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حزمؓ کو یمن کے علاقہ جند کا گورنر بنا کر بھیجا تو وہاں اپنی ذمے داریاں انجام دینے کے لئے مفصل ہدایات تحریری طور پر انہیں دیں۔ یہ دستاویز سارے ذخیرہ دستاویزات میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس میں بہت سے فقہی احکام میسر آتے ہیں۔

۲۸۔ المزینہ قبیلے کے سربراہ بلال بن حارث المزنی ایک مشہور صحابی ہیں، ان کو حضور نے ایک زمین الاٹ کی، بعد میں صحابہؓ کے مشورہ سے ان سے وہ زمین واپس لے لی۔ اس الاٹمنٹ اور تنسیخ دونوں کی دستاویزات موجود ہیں۔

۲۹۔ کاتبان پر ایک کتاب، المصباح المضی فی کتاب النبی الامی ورسلہ الی ملوک الارض من عربی وعجمی، ہے جو علامہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن علی ابن حدیدہ الانصاری نے لکھی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، ایک میں کاتبین وحی

اور وثیقہ نویس صحابہؓ کا تذکرہ ہے جب کہ دوسرے میں دربار رسالت کے سفرا کا ذکر ہے۔ عمر بن شبہ نے بھی کاتبان پر الگ کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نام محمد بن سلامہ القضاعی کا بھی ہے۔

۳۰۔ عمر بن حزم جن کو رسول اللہ ﷺ نے یمن کا گورنر بنایا تھا، ان کو عطا کی گئی دستاویز ان کے خاندان میں محفوظ چلی آتی تھی اور لوگ اس کی زیارت بھی کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں نسل در نسل اسے زبانی یاد بھی رکھا جاتا تھا۔

۳۱۔ مثال کے طور پر ایسی ہی ایک دستاویز یہودیوں نے خلیفہ ہارون الرشید کو پیش کی، خلیفہ نے امام اوزاعی سے اس کی تصدیق کرائی تو انہوں نے دستاویز پر نظر ڈالتے ہی کہہ دیا کہ یہ جعلی ہے۔ خلیفہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ جن گواہان کے نام درج ہیں ان میں حضرت سعد بن معاذ اور حضرت معاویہؓ شامل ہیں جب کہ حضرت معاویہ کے ایمان لانے سے پہلے حضرت سعدؓ شہید ہو چکے تھے، لہٰذا دونوں کا ایک دستاویز کا گواہ ہونا محال ہے۔

۳۲۔ عید میلاد النبی بھی اسی سے منسلک ہے۔ ابن خلکان کے مطابق عید میلاد النبی کی روایت فاطمی خلافت میں شروع ہوئی جو کہ اس کے ساتھ دیگر اہل بیت کا بھی میلاد منایا کرتے تھے۔ میلاد ناموں سے ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ عوام الناس کا معجزوں کے بارے میں اعتقاد بہت بڑھ گیا اور وہ بزرگی اور روحانیت کو معجزے سے مشروط سمجھنے لگے۔ حال آں کہ انبیا کا زیادہ زور اپنی سیرت پیش کرنے پر ہوتا تھا اور معجزہ ضمنی چیز تھی۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی اصل تعلیمات سے صرف نظر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ خطیب بھی رسول اللہ ﷺ کے معجزوں کے بیان سے داد عیش وصول کرنے کو کافی سمجھنے لگے۔ جدید دور میں مصلحین کے لئے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ رہا ہے کہ عوام الناس کو عمل کی طرف کس طرح راغب کیا جائے۔

۳۳۔ ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا یاد کرائی جس میں یہ الفاظ آتے تھے، ونبیک الذی ارسلت، جب اگلے دن ان صحابی سے اس دعا کو سنا تو انہوں نے کہا ورسولک الذی ارسلت تو آپ نے از راہ مذاق ان صحابی کا کان مروڑ کر کہا کہ کیا میں نے یہی کہا تھا تو صحابیؓ کو اصل الفاظ یاد آ گئے۔

۳۴۔ مثال کے طور پر سلسلہ نقشبندیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے واسطے سے حضور ﷺ تک پہنچتا ہے۔

۳۵۔ خلافت ظاہرہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ملی جو کہ اسلامی ریاست کا انتظام سنبھالنے اور اس میں شریعت کے نفاذ سے عبارت ہے۔

۳۶۔ شراب کی ممانعت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا ایک قبیلے کے بارے میں طرز عمل نفسیاتی ترغیب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مسلم اور بخاری کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایک قبیلے کو شراب کی حرمت سے قبل ایسے چار قسم کے برتنوں (الحنتم، النقیر، المزفت، الدباء) کے استعمال سے منع فرمایا جو شراب بنانے میں کام آتے تھے۔

۳۷۔ ایک مرتبہ اندھیرے میں رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ کو مسجد سے گھر رخصت کر رہے تھے کہ اتنے میں دو صحابہؓ کا وہاں سے گزر ہوا، آپ نے دونوں کو روک کر بتایا کہ وہ میری زوجہ صفیہ تھیں۔ انہوں نے کہا کہ بھلا ہم آپ کے بارے میں ایسا گمان کیسے کر سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا شیطان بدگمان کرنے کو ہمیشہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔

۳۸۔ مثال کے طور پر امام سرخسی نے حدیبیہ کی صلح اور خیبر کی فتح کے درمیان جو تعلق قائم کیا ہے وہ جغرافیئے کے

حوالے سے ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کو دو دشمنوں سے خطرہ تھا، جنوب میں قریش اور شمال میں یہود۔ دونوں کا آپس میں گٹھ جوڑ بھی تھا۔ لہٰذا اس وقت کا تقاضا تھا کہ کسی ایک کو جنگ سے باز رکھا جائے۔ اسی لئے جب قریش نے جنگ بندی کی شرط مان لی تو ان کی بقیہ نامناسب شرائط کو فوراً منظور کرلیا گیا جس پر صحابہؓ حیران تھے لیکن بعد میں ان پر یہ حکمت کھلی اور قرآن نے بھی اسے فتح مبین سے تعبیر کیا۔

۳۹۔ رسول اللہ ﷺ کے خارجی امور کے حوالے سے ایک فیصلہ عرب معاشرے کے پس منظر کی حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی نجاشی کو خط بھیجتے تو حضرت عمرو بن امیہ الضمری کو مامور فرماتے۔ اس کا باعث یہ تھا عمروؓ کا نجاشی سے تعلق قبل از اسلام کا تھا اور اس تعلق کے پیچھے پھر ایک لمبی داستان ہے۔ نجاشی کے جب والد کا انتقال ہوا تو وہ کم سنی میں تھا لہٰذا چچا نے تخت پر قابض ہو کر نجاشی کو قتل کر دینا چاہا لیکن وہ جان بچا کر عرب آ گیا اور یہاں بنی ضمرہ میں کسی دوست کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ بعد میں جب حبشہ کے حالات بدلے تو لوگوں نے غاصب حکمران کو وہاں سے نکال کر نجاشی کو بلا کر تخت پر بٹھایا۔ یہ چیز لازماً رسول اللہ ﷺ کے علم میں ہوگی اسی لئے انہوں نے ہمیشہ عمروؓ الضمری کو ہی نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ ہم دردیاں مسلمانوں کے لئے حاصل کی جاسکیں۔

۴۰۔ میثاق مدینہ کے بارے میں سیرت کی کتابوں میں عام طور پر ہے کہ یہ ہجرت کے پہلے سال ہوا تھا جب کہ ابوداؤد کی روایت کے مطابق غزوہ بدر کے بعد کی بات ہے۔

۴۱۔ رسول اللہ کے جد امجد ہاشم کا جب اپنے بھائی عبدالشمس سے باپ کی جانشینی پر اختلاف ہوا تو حضرت عمرؓ کے دادا نے ان کے درمیان منافرہ کروایا جس میں جناب ہاشم کے حق میں فیصلہ ہوا۔

۴۲۔ فلپ ہٹی حدیث کی اسناد کے بارے میں یہ تجزیہ کرتے ہیں: Isnad meets the most essential requirements of modern historiography.

۴۳۔ ایک دفعہ ایک مشہور خارجی سردار نافع بن ازرق کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مقابلہ ہوا۔ اس نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پاک کے بارے میں دوسو سوالات کئے۔ اس موقع پر شاگردوں کا حلقہ کتاب قلم ہاتھوں میں لئے موجود تھا۔ نافع سوالات کرتے گئے اور حضرت عبداللہؓ جواب دیتے گئے۔ یہ سب لکھا گیا اور ایک کتاب مرتب کی گئی جس کا امام بخاریؒ نے جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔

۴۴۔ لیکن اس میں اہل بیت کے حوالے سے تحریر ہونے والی کتب کو بھی شامل کیا گیا ہے، اور اس کا بڑا حصہ اس موضوع پر ہے

۴۵۔ عام طور پر محدثین کا اتفاق ہے کہ آخری صحابی کا انتقال ۱۰۵ یا ۱۰۶ ہجری میں ہوا۔

۴۶۔ محدثین نے تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کا اختتام بالترتیب ۱۷۵ اور ۲۱۵ ہجری کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔

۴۷۔ استیعاب کا مطلب ہے کسی چیز کے بارے میں مکمل معلومات جمع کرنا جب کہ استقصا کا مطلب ہے کسی چیز کو مکمل طور پر بیان کرنا۔

۴۸۔اس سلسلے میں کئی واقعات ملتے ہیں۔ایک واقعہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا ہے کہ جب وہ اپنی بہن کے گھر داخل ہوئے تو بہن نے کچھ لکھا ہوا اپنے گھٹنے کے نیچے رکھ لیا۔

۴۹۔مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے نسخے میں سورہ فاتحہ اور معوذتین کو تحریر نہیں کیا تھا، البتہ اپنی یادداشت کے لئے دعائے قنوت اس نسخے پر لکھی ہوئی تھی۔

۵۰۔مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے قیصر روم کے نام جو خط لکھا تھا وہ امام بخاریؒ نے زبانی روایت کی بنیاد پر اپنی صحیح میں تحریر کیا تھا لیکن آج سے قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اصل نامہ مبارک دریافت ہوا جس پر مشرقی اور مغربی ماہرین نے غور کیا، اس کا بخاری کے روایت کردہ خط سے ذرہ برابر بھی فرق نہ نکلا۔لہٰذا متبادل طریقے سے بھی حدیث کی تصدیق ہوگئی جس پر جدید تاریخ نویسی میں زور دیا جاتا ہے۔

۵۱۔عبدالرزاق صنعانی، امام بخاری کے روات میں شامل تھے اور امام بخاریؒ نے ان سے بہت سی روایات لی ہیں۔عبدالرزاق کی اپنی کتاب تھی جو اس وقت تک چھپی نہیں تھی اب چھپ چکی ہے اور جو روایات امام بخاریؒ نے ان سے لی تھیں وہ جوں کی توں ان کی کتاب میں موجود ہیں۔اسی طرح عبدالرزاق اپنے استاد معمر بن راشد سے روایت کرتے ہیں، ان کی کتاب بھی اس وقت چھپی نہیں تھی لیکن اب چھپ چکی ہے اور عبدالرزاق کی لی ہوئی روایات اس میں موجود ہیں۔اس سے پیچھے چلے جائیں تو معمر نے جن محدثین سے روایت کی تھی ان میں سے بھی کئی ایک کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور موجود ہیں۔

۔حضرت ابوہریرہؓ کا مجموعہ ان کے شاگرد ہمام بن منبہ نے مرتب کیا تھا وہ دریافت ہو چکا ہے اور ڈاکٹر حمیداللہ نے اسے مرتب کیا ہے۔یہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بھی تحریری شکل میں موجود تھا اور انہیں زبانی یاد تھا۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ''صحیفہ الصادقہ'' بھی رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کی اجازت سے لکھا گیا تھا۔اس سے اعتراض کا بطلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا۔یہ ممانعت صرف کاتبین وحی کے لئے تھی کہ وہ صرف قرآن لکھا کریں باقی اصحاب کے لئے نہیں تھی۔

۵۳۔رسول اللہ ﷺ کا صحابہؓ کو یہ فرمانا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا کرو، اس ضمن میں تھا کہ کاتبین وحی بعض دفعہ وحی کے ساتھ اپنی یادداشت کے لئے بین السطور کچھ لکھ لیا کرتے تھے تو اس کے لئے آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ صرف قرآن کے الفاظ لکھا کرو لہٰذا یہ بات بھی حدیث یا سیرت کی معلومات لکھنے کی ممانعت کے لئے نہیں کی گئی۔

۵۴۔عروہ بن زبیرؒ کی مغازی پر جمع کردہ معلومات کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہیں۔سب سے بڑھی ہوئی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کی تمام معلومات کو محفوظ کیا جو کہ سیرت کا بیش بہا خزانہ تھیں۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکر سے جو معلومات لیں وہ بھی بہت اہمیت کی حامل تھیں، خاص طور پر ہجرت کے حوالے سے، خود ان کے والد زبیر بن عوامؓ بھی عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔اس کے علاوہ حضرت زبیر حضرت خدیجہؓ کے سگے بھتیجے تھے، لہٰذا حضرت خدیجہؓ کے بارے میں مستند معلومات بھی عروہ بن زبیر سے ہی میسر آسکتی تھیں۔عروہ بن زبیر کا شمار فقہائے سبعہ میں بھی ہوتا ہے۔ان کے شاگردوں میں بڑی بڑی ہستیاں شامل

ہیں اور سب ان کے علم کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ اموی خلفاء مروان بن الحکم اور ان کے بیٹے عبدالملک بن مروان، جو خود بہت بڑے ثقہ صاحب علم تھے، نے خاص طور پر عروہ بن زبیر کو سیرت کی معلومات مرتب کرنے پر مامور کیا۔ عبدالملک بن مروان (جن کے طرز عمل کو امام مالک سنت کی دلیل کے طور پر لیتے تھے) کی سیرت کی معلومات کے حوالے سے عروہ بن زبیر کے ساتھ خط و کتابت بھی سیرت کی تدوین کا ایک اہم حصہ ہے۔

۵۵۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں اصحاب بدر اہل حل وعقد ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا جب حضرت علیؓ کو لوگوں نے خلیفہ بننے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ بدری کریں گے۔

۵۶۔ یحیی بن معین ایک مشہور محدث تھے اور راویوں کی جرح وتعدیل میں نہایت باریک بین تھے، لہٰذا کسی راوی کے بارے میں ان کی رائے کو فوراً قبول کرلیا جاتا تھا۔ انہوں نے معمر بن راشد کی ثقاہت کی توثیق کی ہے۔

۵۷۔ جرمن مستشرق جوزف ہوروٹس نے ابن اسحاق پر باقاعدہ کتاب لکھی۔ الفرڈ گیام نے ابن اسحاق کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۵۸۔ اس وقت کا یہ رواج تھا کہ استاد اپنے شاگردوں کو اپنی معلومات املا کروایا کرتا تھا جسے شاگرد زبانی بھی یاد کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ باصلاحیت استاد کی معلومات پر اضافہ بھی کیا کرتے تھے اس طرح سے ایک استاد کی معلومات کے مختلف نسخے وجود میں آجاتے تھے۔

۵۹۔ حدیث میں روایت کی جزئیات تک کے بارے میں خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ تک صحت کے ساتھ ثابت ہوں۔ اس سلسلے میں صرف راوی ہی نہیں بل کہ ان کے روایت کرنے کا تمام احوال بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ راوی نے جب سنا تو وہ اکیلا تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ لوگ تھے۔ محدثین نے اس طرح کی کیفیات کو بیان کرنے کے لئے مختلف اصطلاحیں وضع کیں جن سے کہ تمام صورت حال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر امام مسلم حدثنی کا لفظ استعمال کریں تو اس سے مراد ہے کہ کوئی انہیں پڑھ کر سنا رہا تھا اور اگر وہ اخبرنی کا لفظ استعمال کریں تو اس سے مراد ہے کہ وہ کسی کو پڑھ کر سنا رہے تھے اور سننے والا ان کی تصویب کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ خود راوی کا ثقہ ہونا ایک علیحدہ تفصیل ہے اور اسے علم اسماء الرجال کہتے ہیں۔ اسی طرح روایت کا بالمعنی ہونے کی بہ جائے باللفظ ہونا صائب قرار دیا گیا۔

۶۰۔ بقی بن مخلد ایک بڑے مشہور محدث تھے جنہوں نے روایات حدیث جمع کرنے کے لئے پوری دنیائے اسلام کے چھ چکر لگائے اور اس دنیا میں موجود تمام اہل علم سے استفادہ کر کے حدیث کی ایک کتاب مرتب کی جس کے بارے میں تمام محدثین اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حدیث کی اس جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی۔ یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ اسی طرح تفسیر میں امام قرطبی کی تفسیر بہت مشہور ہے جو اس وقت بھی دست یاب ہے اور اپنے مضمون پر ایک مکمل کتاب ہے۔

۶۱۔ ان کے بارے میں خود اہل اندلس نے لکھا ہے کہ وہ اہل مغرب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے موطا امام مالک کی شرح لکھی اور اس کام میں آج تک کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ انہوں نے موطا امام مالک کی

ایک شرح روایت کے نقطہ نظر سے کی اور دوسری شرح فقہی حوالے سے کی۔ اول الذکر کا نام **التمہید لمافی الموطا من الاثار والمسانید** اور آخر الذکر کا نام **الاستذکار لمافی الموطا من مذاہب علماء الامصادر** ہے۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب بھی ان ہی کی لکھی ہوئی ہے جس میں انہوں نے کئی ہزار صحابہؓ کا تذکرہ ہے۔

۶۲۔ یہ پرتگال کے رہنے والے تھے جو اس وقت سپین کا حصہ تھا۔ جہاں یہ رہتے تھے وہ جگہ آج کل لزبن (دارالحکومت) کے قریب واقع ہے۔ قدیم ترین کتابوں میں ان کا باجی کے نام سے جا بجا ذکر ملتا ہے۔

۶۳۔ مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ کی نکاح کے وقت عمر اختلاف کا موضوع ہے۔ اکثریت کا نقطہ نظر بالکل واضح اور متعین ہے کہ ان کی عمر بہت تھوڑی تھی لیکن جدید ذہن اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ابن عبدالبر بھی دوسری رائے کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سابقون الاولون میں سے تھیں۔ چوں کہ ایمان اس کا معتبر ہوتا ہے جس کی عمر کم از کم پانچ چھ سال ہو اس لئے اگر حضرت عائشہؓ کی عمر پانچ سال بھی تسلیم کی جائے تو نکاح کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ بنتی ہے۔

۶۴۔ ابن کثیر شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں جن کی شہرت یہ تھی کہ جس چیز کے بارے میں ان کو شبہ ہوا کہ یہ چیز شریعت کے سو فیصد معیار سے ذرا بھی کم ہے انہوں نے اس کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

۶۵۔ یہ صدر اسلام کے بارے میں معلومات کی ایک کان، ایک خزانہ اور ایک معدن ہے۔ انہوں نے اس میں یہ کوشش کی ہے کہ روایات کا محاکمہ اور موازنہ بھی کیا جائے۔ انہوں نے موضوع روایات کو نظر انداز کیا، کم زور روایات کو الگ کیا اور اسرائیلیات کے بارے میں فیصلہ صادر کیا کہ کون سی قابل قبول ہے اور کون سی نہیں۔ ان کا انتقال آٹھویں صدی ہجری میں ہوا اس لحاظ سے ان کے پاس سات صدیوں کے مصادر موجود تھے جن کی مدد سے انہوں نے اپنی تاریخ کو مرتب کیا۔

۶۶۔ اس سلسلے میں امام مالک کا ابن اسحاق پر معترض ہونا معروف ہے لیکن اس طرح کی آرا منفرد ہیں اور ان پر حتمی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ علاوہ ازیں جرح غیر مفسر تعدیل مفسر پر مقدم نہیں۔ جرح اور تعدیل غیر مفسر اور تعدیل اور جرح مفسر دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک محدث پر کسی راوی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ دینا مناسب نہیں۔

۶۷۔ جدید طرز تحریر میں ہم محدثانہ اسلوب اور مورخانہ اسلوب کا تعلق حوالے کی کتاب (Reference Book) اور عام کتاب (Common Read) کا کر سکتے ہیں۔ حوالہ جاتی کتب کو گہری تحقیق اور مجموعی کاوش سے مرتب کیا جاتا ہے تا کہ اس سے صحیح معلومات بہم پہنچائی جا سکیں۔ عام طور پر لغات اور دوائر معارف اس ضمن میں آتے ہیں جب کہ عام مطالعے کے لئے قاری کو ایسا اسلوب مہیا کیا جاتا ہے جس سے اسے مطالعے میں اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔ البتہ اگر کوئی قاری عام کتاب کا تجزیہ کرنا چاہے تو وہ حوالہ جات اور کتابیات سے مدد لے سکتا ہے جنہیں کہ الگ سے لکھا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی فرق حدیث اور تاریخ کا نکلتا ہے۔

۶۸۔ امام بیہقی آخری محدث ہیں جنہوں نے بہ راہ راست روایت کر کے کوئی کتاب مرتب کی ہے۔ ان کا انتقال

۴۵۸ھ میں ہوا۔

۶۹۔ روایت یہ تھی کہ جب حضرت عمرؓ نے دیوان مرتب کیا تو بنی ہاشم سے آغاز کیا اور پھر اس کی تفصیل۔۔۔

۷۰۔ طبقات طبقہ کی جمع ہے جس سے مراد کسی ایک نسل کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔

۷۱۔ یہ بحث کا تضاد ہے کہ ایک اسلوب روایات کی بہ دولت مثبت تھا اور روایات ہی کی بہ دولت منفی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلوب زیادہ تر منفی ہی تھا جس نے سیرت کے مندرجات کو اس انداز سے پھیلا دیا کہ سیرت کے موضوع کا تعین مشکل ہو گیا اور اس کی حدود کا نام ونشان جاتا رہا۔ دور حاضر میں یہ بات اس طرح عام ہوگئی کہ کسی بھی موضوع کو اٹھا کر اسے سیرت کے ضمن میں زبردستی کی تحقیق کے طور پر پڑھنا شروع کر دیا جاتا ہے جب کہ وہ موضوع حدیث یا تفسیر سے متعلق ہوتا ہے۔

۷۲۔ تاریخ دانوں نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ جب تہذیبوں کا زوال شروع ہوتا ہے تو سنہری تذکروں کو ادیبانہ رنگ دے کر بیان کیا جاتا ہے تاکہ زوال میں اپنے دل کو تسلی دی جا سکے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی قصیدے، مرثیے، نعتیہ کلام اور نام وروں کے تذکرے اس چیز کے غماز ہیں۔

۷۳۔ یہ وہ نام ہیں جنہوں نے سیرت کو مربوط خطوط پر استوار کیا جب کہ اس سے قبل بھی سیرت نگار موجود تھے۔ ایک جرمن محقق اور مستشرق وسٹن فیلڈ نے کم وبیش سوا سو سال پہلے عرب میں علم تاریخ کے آغاز اور ارتقا پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کی تحقیق کے مطابق ابن اسحاق سے پہلے ستائیس افراد تھے جنہوں نے سیرت پر مواد جمع کیا۔ ان میں تین صحابہ کرام کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی تحقیق سے ان میں اضافہ کر کے ان کی تعداد چالیس ثابت کی ہے جن میں چار صحابہ کرام ہیں۔

۷۴۔ ابن سید الناس کا بیان ہے کہ واقدی کے تلامذہ بھی ان کے مورخانہ اسلوب پر اعتراض کرتے تھے اور ہر واقعے کے راویوں کے الگ الگ حالات جاننے پر مصر تھے۔ واقدی نے ان کی بات مان لی اور ان سے کہا کہ انہیں ایک ہفتے کی مہلت دی جائے۔ ایک ہفتے بعد جب وہ آئے تو صرف غزوہ احد کو سنداً بیان کرنے کے لئے ان کے پاس بیس جلدیں تھیں۔ طلبہ نے جب یہ ضخامت دیکھی تو کہا کہ پہلے والا طریقہ ہی ٹھیک تھا۔ لہٰذا انہیں اسی طرز پر درس دینا شروع کر دیا گیا۔

۷۵۔ اسرائیلیات کو محدثین نے قبول کرنے میں تامل کیا ہے لیکن مورخین نے ان اسرائیلیات کو قبول کی روش اختیار کی ہے جو قرآن سے متصادم نہیں۔ اسرائیلیات کو قبول کر کے ابن سعد نے بالواسطہ اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے جسے ہم علامہ اقبال کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ پہلی نبوتیں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تمہید ہیں لہٰذا آپ ﷺ کی نبوت کے بیان میں ان تمہیدی نبوتوں کا بیان بھی ضروری ہے تاکہ ختم نبوت کی عظمت اور حقیقت مکمل طور پر سامنے آجائے۔

۷۶۔ ابو عبیدہ کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ امام بخاری نے ان کی کتاب کا بیش تر حصہ اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ امام بخاری جہاں کسی حدیث میں موجود مشکل لفظ کے معنی بیان کرتے ہیں یا کسی آیت کی لغوی یا لسانی تشریح کرتے ہیں

یا کوئی اور ایسی بات بیان کرتے ہیں جس کا تعلق لغت اور ادب سے ہو تو ابوعبیدہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔

۷۷۔ مثال کے طور پر عکرمہ بن ابی جہل جب ایمان لے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ان کی موجودگی میں ابوجہل کو برا کہنے سے منع فرمادیا۔ اس تصور کے زیر اثر ابن ہشام نے بھی ایسے لوگوں کے بارے میں اشعار کو حذف کر دیا جن کی بنیاد پر بعد کی نسلیں ایک دوسرے کو طعنہ زنی نہ کر سکیں۔

۷۸۔ ابن قیم بہت بڑے فقیہ تھے جس کا ثبوت ان کی کتاب اعلام الموقعین ہے۔ بہت بڑے محدث تھے اور ابن تیمیہ کے سب سے نمایاں شاگرد تھے۔ روحانیات میں بھی درجہ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کی تصنیف مدارج السالکین ہے۔ ان کا مطالعہ قرآن اتنا غیر معمولی تھا کہ قرآن کے بعض ایسے پہلوؤں پر ان کی کتابیں موجود ہیں جن پر پہلے کسی نے نہیں لکھا۔ قرآن پاک کی بدائع پر، اقسام پر، امثال پر بہت عالمانہ قسم کا کام کیا ہے۔

۷۹۔ مثال کے طور پر جب رسول اللہ ﷺ مدینے آئے تو دیکھا کہ یہودی روزے سے ہیں دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ حضرت موسیٰ نے اس دن فرعون سے نجات پائی تھی اس کے شکرانے کا روزہ ہے۔ آپ نے بھی مسلمانوں کو یہ روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اس میں مسئلہ یہ تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے گئے تو ربیع الاول تھا جب کہ یہ روزہ عاشورہ محرم کو رکھا جاتا ہے۔ یہودی اسے اپنے کیلنڈر کے مطابق رکھتے تھے۔ ابن قیم نے اس مسئلے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی طرح شق صدر کے واقعے کو بھی اس کی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۸۰۔ سیر کا موضوع پبلک انٹرنیشنل لا تھا جو کہ قوموں کے مابین معاملات کی تفصیل بیان کرتا ہے جب کہ پرائیویٹ انٹرنیشنل لا میں دو ممالک کے تعارض قوانین سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ملک کے باشندوں کے قانون کا اطلاق دوسرے ملک میں کیوں کر ہوگا۔ یہ ایک طرح سے سیر کے موضوع میں ایک نئی جہت تھی جو ابن قیم نے دی۔

۸۱۔ انسان سے مراد آنکھ کی پتلی بھی ہوتی ہے۔ موضوع سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آنکھ کی پتلی آنکھ کے اندر ہوتی ہے اس طرح رسول اللہ ﷺ کا ذکر مبارک لوگوں کی آنکھوں میں ہونا چاہئے۔

۸۲۔ خطبہ حجۃ الوداع مکمل طور پر اس کتاب میں ملتا ہے۔

۸۳۔ یہ بہت بڑے عالم تھے اور معاشیات کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے ہی وہ اصول دریافت کیا تھا جو مغربی لکھنے والے گریشم سے منسوب کرتے ہیں۔ گریشم لا یہ ہے کہ جعلی سکہ اصلی سکے کو شکست دے دیتا ہے۔ یہ لا گریشم نے نہیں بل کہ اس سے قبل مقریزی نے بیان کیا تھا۔

۸۴۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، السنن الکبری للبیہقی: جز ۱۰، ص ۱۹۲

۸۵۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق یہ تصور بھی تعبیر کی غلطی ہے۔ ان کا مشن اس لئے صرف تبلیغی نظر آتا ہے کہ اگلے مراحل ابھی باقی تھے کہ انہیں دنیا سے اٹھالیا گیا۔ اس بات کا ایک ثبوت تو خود بائبل کا یہ بیان ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کی تکلم میں درج ہے کہ میں دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے نہیں بل کہ تلوار دے کر بھیجا گیا ہوں دیکھئے مقدس بائبل، عہد نامہ قدیم۔ لاہور، بائبل سوسائٹی، ۲۰۰۲: ص ۱۳۔ اس کا دوسرا ثبوت قرآن وحدیث کی پیشین

گوئیاں ہیں کہ جس میں عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا زمین پر اگلا مرحلہ بیان ہوا ہے کہ وہ امام مہدی سے مل کر دجال سے قتال کریں گے اور دنیا میں اسلام کو ایک نظام کے طور پر، جس میں کہ لامحالہ حکومت ایک بنیادی عنصر ہوگی، قائم کریں گے۔

۸۶۔ اس بات کا ایک موقع وہ تھا جب سرداران قریش آپ ﷺ کی شکایت لے کر ابوطالب کے پاس آئے کہ ان میں اور آپ میں مصالحت کی کوئی راہ نکل آئے۔ ابوطالب نے اس چیز کا خیر مقدم کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یَاعَم اِنِّیْ اُرِیْدُھُمْ عَلٰی کَلِمَۃٍ وَاحِدَۃٍ تَدِیْنُ لَھُمْ بِھَا الْعَرَبُ وَتُوَدِّیْ اِلَیْھِمْ بِھَا الْعَجَمُ الْجِزْیَۃَ۔ مسند احمد، مسند عبداللہ بن العباس: جز ۷، ص ۲۷۷۔

۸۷۔ کہ جس بیت اللہ کی وجہ سے یہ مراعات حاصل ہوئی ہیں اس بیت اللہ کے کچھ حقوق بھی تم پر عائد ہوتے ہیں۔ بیت اللہ کی تولیت اور خدمت سے جو اعزاز حاصل ہوا اور جو بین الاقوامی شناسائی ملی ہے اس کا کم سے کم اتنا تو حق ادا کرنا چاہئے کہ اس پروردگار کی عبادت کریں جس پروردگار کے نام سے یہ گھر منسوب ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ جس خاندان کی بہ دولت تمہیں یہ شرف حاصل ہوا اسی کے چشم و چراغ پر تم ظلم ڈھا رہے ہو۔

۸۸۔ رسول اللہ ﷺ نے عثمان سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ایک دن آئے گا جب کعبے کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں جس کو چاہوں گا دوں گا تو عثمان نے طنزیہ کہا تھا کہ قریش تو پھر سب مر گئے ہوں گے یا ذلیل ہو گئے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں وہ قریش کی عزت کا دن ہوگا۔ جب فتح مکہ کے موقع پر آپ فاتحانہ کعبے میں داخل ہوئے تو عثمان کو وہ الفاظ یاد دلائے۔ اس سلوک کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چابیوں کا مطالبہ کیا لیکن آپ ﷺ نے یہ بات عثمان کے خاندان میں ہی قائم رکھی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ شرف تم سے صرف ظالم ہی چھین سکتا ہے۔ خذو ھا یابنی طلحہ! خالدۃ تالدۃ ،المعجم الاوسط للطبرانی، باب من اسمہ احمد، جز ۱، ص ۴۹۴۔ لاینزعھا منکم الاظالم، یعنی حجابۃ الکعبۃ، مصنف عبدالرزاق، جز ۵، ص ۸۵۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کے پیش نظر کسی جابر سے جابر حکم ران کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ بنی عبدالدار سے یہ حق چھین سکے۔

۸۹۔ ان میں سے ایک نے جن کا نام ایاس بن معاذ تھا آپ ﷺ کی دعوت سن کر کہا تھا کہ یہ بات اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم یہاں آئے ہو لیکن سالار قافلہ ابوالحسیس نے کنکریاں اٹھا کر ایاس کو ماریں اور کہا کہ ہم یہاں اس لئے نہیں آئے (طبری)۔ ایاس کے بارے میں بھی مذکور ہے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔

۹۰۔ اس حقیقت سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ بیعت کسی مشن کی تکمیل کے لئے ایک نظم کا نام ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مکے میں اس طرح کی کسی بیعت کا اہتمام نہیں فرمایا اور نہ ہی پہلے سال اسلام قبول کرنے والے مدینے کے لوگوں سے بیعت لی۔ یہ نظم حکومت کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کسی تحریک کی شکل میں بھی۔

۹۱۔ اسے بیعت النساء کہتے ہیں کیوں کہ جس میں کہ وہ شرائط آتی ہیں جو سورہ ممتحنہ میں عورتوں سے بیعت کرنے کے لئے عائد کی جاتی ہیں اور اس میں جنگ سے استثنا ہوتا ہے کیوں کہ عورتوں کے لئے جنگ لازم نہیں۔ جب کہ

دوسری بیعت بیعت الحرب کہلاتی ہے کہ جس میں اسلام کے لئے جنگ پر اتفاق ہوا تھا۔

۹۲۔ یہ بات بین السطور بھی عیاں ہے کہ جو شقیں مسلمانوں سے متعلق ہیں ان میں انہیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں گے۔ ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے نکات غیر مسلموں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں اٹھائے جاسکتے تھے بل کہ یہ خالص مسلمانوں کی مجلس کا معاملہ تھا۔

۹۳۔ اس معاہدے کی عام طور پر غلط تعبیر کی جاتی ہے جس کا ایک مظہر کانگرس کے حامی قوم پرست مسلمانوں کا موقف تھا جو متحدہ قومیت کا پرچار کررہے تھے حال آں کہ امة مع المومنین اور امة من المومنین کا فرق بہت بدیہی ہے۔

۹۴۔ اس سے قبل قبائل کی قوت کے حوالے سے ان میں تفریق روا رکھی جاتی تھی۔ بعض قبائل کو آدھی دیت ادا کی جاتی تھی جب کہ طاقت ور قبائل اپنے لئے دوگنا دیت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس معاہدے سے تمام قبائل میں مساوات کا اصول رائج ہوگیا۔

۹۵۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کی شکل جبرائیل اپناتے تھے جب انہیں انسانی شکل میں آنا مقصود ہوتا۔ لہٰذا غیر معمولی طور پر خوب صورت تھے۔

۹۶۔ حضرت رملہؓ کے مکان کے بارے میں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ بہت بڑی حویلی تھی۔ زیادہ تعداد ہونے کی صورت میں عبدالرحمٰن بن عوف کے علاوہ مغیرہ بن شعبہ کے مکان کو بھی استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اور اگر پھر بھی جگہ کم پڑتی تو مسجد نبوی کے صحن میں اور باہر خیمے لگا دیئے جاتے۔

۹۷۔ وفد کی واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو زادراہ کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی تو حضرت عمرؓ نے بسیار کوشش کے بعد اتنے آدمیوں کے لئے زادراہ کے انتظام میں معذوری کا اظہار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ رملہ کے باغ کی کھجوریں ہی دے دو۔ حضرت عمرؓ نے درختوں کا جائزہ لیا تو وہ بھی ناکافی معلوم ہوئیں لیکن انہوں نے کھجوریں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ حکم نبوی کی برکت سے تمام لوگوں کو کھجوریں دے دی گئیں لیکن درختوں سے کھجوروں کی تعداد کم نہ ہوئی۔

۹۸۔ امام ابوعبیدہ نے کتاب الاموال میں نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی دستہ بھیجتے تو خاص ہدایت فرماتے کہ دھوکہ مت دینا، مال میں ہیرا پھیری مت کرنا، کسی سے خیانت اور وعدہ شکنی مت کرنا، کسی لاش کی بے حرمتی مت کرنا اور کسی عورت یا بچے کو قتل مت کرنا، کسی پادری یا مذہبی شخصیت کو قتل مت کرنا۔

۹۹۔ مستدرک حاکم میں سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابوبکرؓ رسول اللہ کی بارگاہ میں وزیر کا درجہ رکھتے تھے۔

۱۰۰۔ منجنیق کو ٹینک اور دبابہ کو بکتر بند گاڑی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

۱۰۱۔ اس پر ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک مضمون Military intelligence during the Life Time of the prophet of Islam جو پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کے مجلے میں چھپا ہے۔

۱۰۲۔ بعض لوگوں نے قرآن کے اس حکم سے کہ تجسس مت کرو (سورہ الحجرات) یہ نتیجہ نکالا کہ جاسوسی منع ہے۔ لیکن اس تجسس سے مراد یہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سوچی ہو اور اس کو نقصان پہنچانے کے لئے اس کی جاسوسی

کی جائے۔

۱۰۳۔ حافظ شامی نے سیرت شامی کے آٹھ ابواب میں سے ایک پوری فصل میں رسول اللہ ﷺ کے زیر اثر مسلمان قاضیوں کے فیصلے جمع کئے ہیں۔

۱۰۴۔ حضرت عتاب بن اسید مکہ کے قاضی تھے ان کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا کہ جو سودی دعوی حرمت سود سے پہلے کا تھا اس سے سود باطل نہیں ہوتا۔ انہوں نے مدینہ سے رہ نمائی حاصل کی۔

۱۰۵۔ امام ابوبکر بن ابی شیبہ مشہور محدث ہیں امام ابوداود اور امام ترمذی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے بھی اقضیۃ الرسول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فیصلوں کو ذکر کیا ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے بھی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی تھی۔

۱۰۶۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔

۱۰۷۔ مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام میں جاہلیت کے زمانہ کی تمام فضیلتوں اور اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا۔

مولانا سید زوار حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ یادگاری خطبات

خطبات کراچی

مجموعہ محاضرات

اسلام اور مغرب، موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز
اسلامی شریعت، مقاصد و حکمت
اسلامی سزاؤں کا تصور اور مغربی قوانین، ایک تقابل
علم سیرت اور مستشرقین

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین
سید عزیز الرحمن

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز: اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی۔ فون: 021-36684790

www.rahet.org E-mail: info@rahet.org